شگوفے

رضوان اللہ

جملہ حقوق بہ حقِ مصنف محفوظ

کتاب کا نام : شگوفے
مصنف کا نام : رضوان اللہ
کمپوزنگ : خالد فیصل
ناشر : رضوان اللہ

D-178، ابوالفضل انکلیو-1، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
فون:9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

غیر مطبوعہ

شگوفہ ہائے قلم زاد انچہ پیشم است
چوں لختہائے دلِ ریشِ خویشم است
چہ بارِ یادِ شناسائیہا گویم
کمر خمیدہ برم من بدوشم است

فہرست

شگوفے	1
اوراقِ ہستی	5
کلکتہ کی اردو صحافت اور میں	19
اوراقِ مصور	28
ہمارے گاؤں ہمارے لوگ	38
متاعِ سحر	46
بےادبیات	52
My Reflections	57

بازدید

مصنف کو اپنی تصنیف شاید اپنے بچوں ہی جیسی عزیز ہوتی ہے، کوئی کم کوئی زیادہ۔ اس کلیہ کا اطلاق مجھ پر بھی ہوتا ہے۔ مجھے اپنی تحریریں اچھی لگتی ہیں لیکن جب انھیں کسی کتاب کی صورت میں ایک قاری کے طور پر دیکھتا ہوں تو نظر کچھ تنقیدی ضرور ہو جاتی ہے۔ بہرحال مجھے اپنی کتابوں کے دیباچے بہت اچھے لگتے ہیں چنانچہ کبھی کبھی اپنی کتابیں اٹھا کر ان کے دیباچے پڑھتا ہوں۔ اس میں ایک طرح کی تازگی کا لطف آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ذہن اس ماضی میں کھو جاتا ہے جب وہ دیباچے لکھے گئے تھے۔ شاید اس طرح موجودہ کدورتوں سے کچھ دیر کے لیے دل ہٹ جاتا ہے۔ چنانچہ خیال ہوا کہ انھیں کیوں نہ اکٹھا کر دیا جائے۔ موجودہ کتابچہ بعنوان ''شگوفے'' اسی فکر کا نتیجہ ہے۔

اس شگوفہ کاری میں دیباچوں کو ان کے سالِ تصنیف کے اعتبار سے نہیں ترتیب دیا گیا ہے بلکہ قیاسی طور پر ایک ترتیب دے دی گئی ہے۔ انھیں اپنی بے پناہ اور ناپیدا کنار تنہائیوں میں پڑھتا ہوں اور متعلقہ تصنیف سے ذہنی طور پر گزر جاتا ہوں۔ متواتر بازدید کا لطف آتا ہے۔ اب جبکہ اور کوئی لطف باقی نہیں رہا یہ خود فریبی اچھی لگتی ہے۔

رضوان اللہ

۲۰ر فروری ۲۰۲۱ء

اوراقِ ہستی

رضوان اللہ

چو سیرِ گلستاں بہ پایاں رسید
ثمر ہائے کِشتم بہ داماں رسید
بتوفیقِ و تائیدِ پروردگار
بہ اوراق احوالِ رضواںؔ رسید

رضوان اللہ

دیباچہ

ادب میں سوانح نگاری نسبتاً کم ہوئی ہے، خودنوشت تو اور بھی کم۔ سوانح عمری تو دراصل انہی لوگوں کی درخوراعتنا ہوتی ہے جن کی زندگی کا ہر روز تاریخ کا ایک نیا ورق یا جن کا فرمایا ہوا ہر لفظ زندگی کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ لیکن دلدادگان گلگشت کے لیے سبزے کی روئیدگی بھی فردوس نظر ہوتی ہے اور اہلِ بصیرت کے نزدیک اس بے بساط کی کہانی بھی سارے باغ کی کہانی کا ایک حصہ ہوتی ہے جہاں گل وبلبل کی داستانوں کے ساتھ ہی صیاد و گلچیں کی چیرہ دستیوں اور بہار وخزاں کے مناظر بھی دوہرائے جاتے ہیں۔ شاید وہی بے بساط سبزہ باغ کی کہانی کا پھولوں اور کانٹوں سے زیادہ معتبر راوی ہے۔

ہر تصنیف کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس نے لکھی اور کب لکھی گئی۔ کسی مصنف کی شخصیت اپنے عہد کی پیداوار ہوتی ہے اور تصنیف اس کی تخلیق۔ بہ الفاظِ دیگر ہر تصنیف اپنے عہد اور زمانے کی پیداوار اور اس کی آئینہ دار ہوتی ہے چنانچہ خودنوشت سوانح عمری کا مصنف اپنے عہد کی تاریخ کا ایک حصہ، خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، ہوا کرتا ہے۔ وہ تاریخ جس کے ارتقا یا ترتیب وتشکیل میں وہ خود شریک تھا یا جیسا کہ اس کے مشاہدے میں آیا۔ گویا سوانح نگاری ایک تذکرہ ہے اور تبصرہ بھی با ایںہمہ اسے تاریخ کے استناد کا درجہ نہیں حاصل ہوتا، شاید اس کے لیے دیگر شواہد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ضمناً ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں مجھے اس سوانح نگاری سے بحث نہیں ہے جسے کوئی صاحب قلم اپنے ممدوح، محسن یا ہیرو کی زندگی اور کارناموں کو اجاگر

کرنے کے لیے لکھتا ہے یا ان کے دوام کی غرض سے قرطاس وقلم کے حوالے کرتا ہے۔ ایسی تصنیفات کی ادبی اور تاریخی حیثیت خواہ کتنی ہی ارفع واعلیٰ کیوں نہ ہو ان میں وہ بات ہرگز نہیں پیدا ہوسکتی جو کسی لکھنے والے کے اپنے محسوسات کے خود اظہار میں ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ ممدوح کے حالات وواقعات وصفات کے بیان میں مبالغے کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ عظیم شخصیات سے بطور سوانح جو کچھ دستیاب ہوتا ہے وہ بالعموم ان کی یادداشتیں یا ڈائریاں ہوتی ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے لیکن وہ ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہوں گی۔ یادداشتیں بروقت محرکات ومحسوسات کے تحت لکھی جاتی ہیں ان میں وقتی جذبات اور وقتی مصالح کارفرما ہوں تو کچھ بعید نہیں۔ وہ کوئی مسلسل اور مربوط تحریر بھی نہیں ہوتیں جبکہ دیگر تصانیف ان سے بہت مختلف اور مرتب ہوتی ہیں۔ ان دونوں مختلف اقسام کی تحریروں میں اور بھی بہتیری مماثلتیں اور عدم مماثلتیں ہوتی ہیں یہاں مجھے اس سے بھی بحث نہیں ہے۔

بات خودنوشت سوانح عمری کی ہے جو بالعموم عمر کے اس حصے میں لکھی جاتی ہے جب سوانح نگار کو یقین اور اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی عملی زندگی امکانی حدود میں کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہوئی ہے۔ تشنگی کا باقی رہنا اور بات ہے۔ یہ تو زندگی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور زندہ رہنے کے لیے ایک ضرورت بھی۔ لیکن صاحبِ تصنیف کا زندگی کے اس مرحلہ یا منزل تک پہنچ جانا ہی کافی نہیں، لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات میں دوسروں کو شریک کرنے کا جذبہ اور حوصلہ بھی رکھتا ہو اور اس کے ذہنی اور جسمانی قویٰ بھی اس کے اس عزم میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔

عمر کی اس منزل میں پہنچ جانے کے بعد بچپن ایک حسین خواب اور جوانی ایک لذت آفریں سراب نظر آنے لگتے ہیں اور شاعر یہ کہنے میں حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ''جو کچھ کہ

دیکھا خواب تھا اور جو سنا افسانہ تھا۔'' عمر کی اس منزل میں ہم عموماً تنقید وتبصرہ سے بھی بڑی حد تک بے پروا اور بے نیاز ہوجاتے ہیں اس لیے گزرے ہوئے زمانوں کی افسانوی حقیقت جتنی بھی اور جیسی بھی یادداشت میں محفوظ رہ جاتی ہے یا اتنی دور سے جیسی بھی نظر آتی ہے اس کے اظہار و بیان میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے اس لیے لکھنے والے کے بیان کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر اس کی نیت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

میں جو کچھ لکھنے کی جسارت کررہا ہوں اس کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ یہ نہ صحافت نہ سوانح نہ تاریخ کا کوئی ناقابل فراموش باب ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر میں نے یہ زحمت کیوں گوارہ کی؟ اس کا بنیادی سبب میرا یہ یقین ہے کہ یہ دنیا جب اور جس لمحہ وجود میں آئی اسی وقت سے اس کی تکمیل اور تشکیل کا ارتقائی عمل جاری ہے اور جب تک کرۂ ارض پر کوئی نفس باقی ہو یہ عمل جاری رہے گا اس میں ہر ذی روح کا حصہ ہے، کتنا حصہ ہے یہ اس کی قوتِ عمل، صلاحیت کار، صلابتِ رائے وغیرہ جیسی صلاحیتوں اور حالات کی سازگاری پر بھی منحصر ہے۔

کسی نے پہاڑ سے پتھر کی سلیں تراشنے کا کام اپنے ذمہ لیا، کسی نے ان سلوں کو نقوش و نگار سے مزین کیا، کسی نے ان کو یکجا کرکے ایک طرزِ حسن عطا کیا، کسی نے ایک خواب کو تاج محل کی صورت میں ٹھوس حقیقت میں مبدل کردیا لیکن کیا اس تمام عمل میں اس اولیں سنگ تراش کا حصہ کسی طرح کم اہم تھا؟

کسی نے انسان کو جینے کا سلیقہ سکھایا، کسی نے زندگی کا بہتر رنگ ڈھنگ بتایا، کسی نے لکڑی کے کندے میں پہئیے کی ایجاد کرکے انسان کو رفتار آشنا کیا، کسی نے پھول اور سبزے کی آبیاری اور تراش وخراش سے باغ و بہار کا رنگ تیز کیا، کسی نے صرف باغ کی پہریداری کی کہ خیابانوں کو نقصان سے محفوظ رکھے تو کیا اس دربان کی کارگزاری کسی طرح کم اہم ہے؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اس ترقی پذیر دنیا میں نہ ایٹم دریافت کرسکا، نہ چاند گاڑی

بناسکا، نہ چاند پر جاسکا، نہ تاریخ انسانی پر چودہ جلدیں تصنیف کرسکا، نہ اخلاقیات پر دراسات کے انبار لگاسکا، ایسا کچھ بھی نہیں کرسکا نہ سہی لیکن جو کچھ اور جتنا کچھ کرسکتا ہوں اس کو کرنے سے کیوں باز رہوں؟ قدرت نے کسی کو اس کی صلاحیت سے زیادہ کا کفیل نہیں بنایا۔

لیکن میری یہ کاوش، میری یہ جسارت اپنی تمام کم مائیگی اور کمزوریوں کے باوجود بے مقصد نہیں۔ قدرت نے دنیا میں کسی چیز کی تخلیق بلا مقصد نہیں کی۔ انسان تلاش و تکمیل مقاصد سے اپنی زندگی کو بہتر اور مکمل تر بناتا جائے گا ایسے میں اس کی مخلوق بلا مقصد کوئی تخلیق کیوں کرے! یہ ضرور ہے کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شروع سے آخر تک بات میری نظر آئے گی لیکن اس کا بیشتر حصہ مجھ جیسے کمتر انسانوں کے دکھ سکھ، ان کی راہوں کے روڑے، ان کی تمناؤں اور شادمانیوں اور ان کی مایوسیوں اور محرومیوں کی عکاسی کی ایک حقیر کوشش ہے۔ خود میری زندگی ایسی سپاٹ اور بے آہنگ ہے کہ اس میں شاید ہی کوئی منظر ایسا ہو جس پر لمحہ بھر بھی نظر ٹک سکے۔ یہ ایک بے برگ و گیاہ سطح مرتفع ہے اس لیے میں دراصل بات اپنے معاشرے کی کرنا چاہوں گا لیکن کسی حوالے سے اور وہ حوالہ خود میری ذات ہے۔ جب ''سرِّ دلبراں'' ہی نہیں تو ''حدیثِ دیگراں'' کی ضرورت بھی کہاں باقی رہتی ہے۔

تاہم ہر خودنوشت سوانح عمری میں دیگر بہتیری سوانحات کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہوتا ہی ہے کیونکہ صاحبِ تصنیف کی زندگی، اس کی مصروفیاتِ شب و روز، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں دوسری بہتیری شخصیات کا عمل دخل ہوا کرتا ہے ان میں سے بیشتر کا تذکرہ کسی نہ کسی طور لکھنے والے کی سوانح عمری میں شامل ہونا عین ممکن ہے۔ مزید برآں اس کی پسندیدہ یا ناپسندیدہ شخصیات ایسی ہوسکتی ہیں جن کا تذکرہ صاحبِ تصنیف ضروری سمجھتا ہو۔ اس طرح ایک سوانح عمری ان گنت حلقوں کا ایک سلسلہ یا زنجیرہ ہوسکتی ہے۔ یہی حقیقت سوانح نگار کو اپنے عہد کا شاہد بناتی ہے۔

میں اس تہذیب کے چل چلاؤ کا شاہد ہوں جس کی سانس ایک صدی پہلے اکھڑ

چکی تھی اور جس کے ماتم گساروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ جب اس مریض کو بچانے کی سب تدبیریں ناکام ہوگئیں، اس کی نبض ڈوبنے لگی اور اس کی پیشانی ٹھنڈے پسینے سے تر ہوگئی تب میں نے اس کے بچے کھچے آثار دیکھے۔ ڈوبتی نبض کے وقت اس کی شائستگی دیکھی، روایات کا پاس دیکھا۔ چاہتا ہوں کہ میری اس تحریر کو پڑھنے والے جنھوں نے ناولوں اور افسانوں میں اس تہذیب کی جھلکیاں دیکھی ہوں گی اسے دوٹوک الفاظ میں بھی پڑھ لیں۔

میں نے وہ عہد نہ صرف دیکھا بلکہ خوب خوب بھگتا ہے جب برصغیر کی اردو صحافت اس بری طرح کٹ چھنٹ گئی تھی کہ اس کی شکل وصورت مسخ ہوگئی تھی۔ تاحدِ نظر گھپ اندھیرا تھا، نہ نشانِ منزل تھا نہ کوئی رہنما۔ اربابِ نظر میری اس تحریر میں ان مناظر کی جھلکیاں دیکھ سکیں تو دیکھ لیں۔ میں ان بے نام ونشان اردو صحافیوں کو سلام کرتا ہوں، ان کی یاد میں سر جھکاتا ہوں جنھوں نے اپنے فن اور پیشے کی لاج رکھی، نامعلوم اور ناہموار راہوں پر بڑھتے رہے اور بالآخر وہ زمین ہموار کی جس پر آج اردو صحافت کے اجارہ داروں کے عالیشان محل تعمیر ہورہے ہیں۔

میں بعض غیر صحافتی رویوں کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا جس نے قوم اور ملت کو بے قیاس نقصان پہنچایا۔ ہر کسی کو میری رائے سے اتفاق یا اختلاف کا حق ہے اور جیسا کہ عرض کرچکا ہوں اب میں زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے بے لاگ لپٹ کہہ سکتا ہوں اس سے میرے ذاتی سود وزیاں کی وابستگی کا زمانہ چلا گیا اس کا گمان بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

آخر میں اپنے بعض مشاہدات بیان کرنا چاہوں گا۔ سیر وسیاحت کرنے والوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاید زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، تاہم لوگ لکھتے رہیں گے کیونکہ ہر کسی کا اپنا زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ ہر کوئی قطب مینار کو اپنے قد وقامت، اپنی قوتِ مشاہدہ اور اپنی بصارت کے اعتبار سے ہی دیکھ سکتا ہے اور جیسا اس کو نظر آئے گا اپنی قدرتِ کلام کے

مطابق ویسا ہی بیان کرے گا۔ جسے سیاحت کہتے ہیں میرے حصے میں تقریباً نہیں آئی۔ اشتیاق بے حد تھا لیکن دفتری مصروفیات اور کام کے تئیں شاید حدِ اعتدال سے متجاوز خلوص نے سیر وسیاحت کے مواقع ہوتے ہوئے بھی اس سے دور ہی رکھا۔ میں اسے اپنی کم نگہی پر بھی محمول کرتا ہوں۔ اس میں اس نفسیات کو بھی بڑا دخل ہے جس کے تانے بانے میری پرورش کے سخت ترین ماحول میں بنے جا رہے تھے، وہ ماحول جس نے مجھے بدترین حالات میں سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ سکھایا، وہ میری بڑی توانائی تھا اور بڑی کمزوری بھی ثابت ہوا۔

میں نے اس تصنیف کو ''اوراقِ ہستی'' کا نام دیا ہے اور اسے چار ''ورقوں'' میں تقسیم کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب آپ بیتی کی ورق گردانی کا استعارہ ہے۔ زندگی ایک تسلسل ہوتی ہے اور کئی سلسلوں کا مرکب بھی۔ ان کی ترتیب میں آسانی کی غرض سے میں نے ''اوراق'' میں تقسیم کی تدبیر اختیار کی ہے۔

پہلا ''ورق'' خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت اور تلاشِ معاش کے ابتدائی مراحل سے متعلق ہے۔ یہی عرصہ گزشتہ صدی میں برصغیر کا انتہائی انقلاب انگیز دور بھی تھا۔ بادِ مخالف کے جھکڑوں میں اپنی جگہ پاؤں جمائے رکھنا بڑے حوصلے کی بات تھی وہ حوصلہ مجھے کیسے ملا یہ کہنا مشکل ہے، وہ ایک لاشعوری عمل تھا لیکن وطنیت کے شدید احساس نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس باطنی قوت نے مجھے مخالفوں کے سامنے بھی سر اٹھا کر اور آنکھ ملا کر بات کرنے کا حوصلہ بخشا۔

دوسرا ''ورق'' میری پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے جب میں نے اردو صحافت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور اسے ڈھوئے پھر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر میں اردو صحافت پر وہ عرصہ انتہائی حوصلہ شکن تھا لیکن کئی سرکاری ملازمتوں میں تاک جھانک کے بعد میں نے اس پیشے کو بہ رضا ورغبت قبول کیا تھا شاید آزادی پسند مزاج اور فطری انانیت سے وہ میل کھا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ میری مجبوری بن گیا، میری ذاتی زندگی کے نشیب وفراز اس میں

شامل ہوکراس ''ورق'' کواوراگلے''اوراق'' کوبھی پیچ در پیچ کرتے گئے۔جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک زندگی کئی زندگیوں کا تسلسل ہوتی ہےاس لیے یہ پیچیدگیاں ناگزیر تھیں۔

تیسرا ''ورق'' دراصل اسی پیشہ ورانہ زندگی کا تسلسل ہے اور ذاتی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ رواں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سفارت خانوں سے وابستہ صحافیوں کو روایتی صحافت سے مختلف قسم کی صحافت سے سابقہ ہوتا ہے جس میں سرکاری ملازمت کے آداب اور سفارتی نزاکتوں کے تقاضے سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سفارت کار صحافی باہر سے خواہ کیسے ہی نظر آئیں یا انھیں کیسے ہی رنگ میں پیش کیا جائے انھیں مفید کام انجام دینے کے بڑے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ صحافتی برادری کو ان سے تعاون کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں جس میں اپنے ہم پیشہ افراد پر اس اعتماد کا عنصر بھی شامل ہے کہ وہ معتبر اور غیر معتبر افراد اور افعال میں تمیز کرنے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔

چوتھا ''ورق'' ان مقامات کے بارے میں میرے مشاہدات سے متعلق ہے جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان مشاہدات اور ان کے تذکروں میں کوئی گہرائی نہیں ہے لیکن میرے لیے وہ بھی زندگی کے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شخصیات سے متعلق ایک ''ورق'' ہونا چاہیے تھا لیکن موقع محل کی مناسبت سے جابجا ان کا تذکرہ کرتا گیا ہوں اس لیے مزید کسی ''ورق'' کے اضافے سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اردو زبان عربی کی ثقالت، فارسی کی لطافت اور دیسی بولیوں کی چاشنی کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں شدید ترین اور لطیف ترین احساسات کے اظہار کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے، جس پر اس زبان کی ادبی بلکہ شعری روایات نے صیقل کر کے اسے دوآتشہ بنا دیا ہے۔ بحیثیت ایک صحافی میری زبان کو سادہ اور بیان کو سیدھا اور صاف ہونا چاہیے۔ صحافت ایک ترسیلی عمل ہے، عبارت جتنی ہی سیدھی اور صاف ہوگی

افکار کی ترسیل اور اثر انگیزی اتنی ہی بہتر ہوگی۔ لیکن صرف خبر نگاری یا ترجمہ ہی تو صحافت نہیں ہے، اداریہ اور سرخیاں بھی تو اس فن کا جزوِ اعظم ہیں۔ اداریہ کبھی دوٹوک عبارت کا طالب ہوتا ہے تو کبھی سیاست کے تمام داؤں پیچ کو مضمون میں سمونے کا فن چاہتا ہے۔ دوسری طرف سرخیاں ہمیشہ پرزور الفاظ وعبارات اور پرکشش اظہار کا مطالبہ کرتی ہیں یہ الگ الگ تقاضے ہیں جن سے صحافیوں کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے وہی ان کی زبان کو تخلیقی ادب کی زبان سے مختلف بنا سکتے ہیں۔

موجودہ تصنیف میں میں نے حتی الوسع صاف گوئی اور بے لاگ بیانیہ زبان سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ، وہ بھی اخباری ترجمہ، کی کثرت تحریر میں اوریجنلٹی کا لطف زائل کردیتی ہے۔ اس سُقم سے بھی حتی الوسع بچنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوسکا ہوں یہ فیصلہ کرنا اہلِ نظر کا کام ہے۔

زندگی کی بساط پر ایک ہی بازی کھیلی جاسکتی ہے جس کے دوران مشکل اور آسان، غور طلب اور سکوت بہ لب مراحل آتے جاتے رہتے ہیں۔ کھیلنے والا اگر دلچسپی لے تو ان کوائف سے اصل کھیل کے لطف میں فرق نہیں آتا۔ مہرے گرتے جاتے ہیں، بچے کھچے مہرے مضمحل اور سست گام ہوتے جاتے ہیں۔ جب کھیل کا اصول یہی ٹھہرا تو پھر کسی شکوے کی گنجائش کہاں رہی۔ ابھی بازی جاری ہے یہی کیا کم ہے۔

۱۹۹۲ء کے بعد کسی وقت بازدید حیات کا سلسلہ موقوف کرکے اس کو طاق نسیاں کے حوالے کردیا تھا پھر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ چار کتابوں کا انگریزی سے اردو میں چار کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرڈالا۔ اخبارات و رسالوں میں مضامین لکھنے لگا کہ یہ مرض کافی پرانا تھا، کوئی پونے تین سو مضامین لکھ ڈالے،۔ انگریزی رسالہ ملی گزٹ نکلا تو ایک کالم کے ساتھ اس میں شریک ہوگیا اور اگلے تین چار برسوں میں تقریباً ایک سو مضامین لکھ ڈالے، اللہ رزاق ہے اس نے میرے قلم کے لیے ایک نئی غذا فراہم کی۔ امریکی سفارت

خانے کا مایہ ناز مجلّہ اسپین کا اردو ایڈیشن جاری ہوا تو اس کے لیے کوئی چار برسوں میں گن کر 272 مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرڈالا۔ پھر تصنیفات کا عارضہ لاحق ہوگیا اور 'بے ادبیات' (۲۰۰۰ء)، 'اوراق مصور' (۲۰۰۲ء)، 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' (۲۰۰۶ء)، 'متاع سحر' (۲۰۰۸ء)، 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ' (۲۰۱۱ء)، My Reflection (۲۰۱۳ء) اور کافی وقفے کے بعد اب اس پوتھی کو اٹھایا ہے لیکن اس دوران خاموش نہیں بیٹھا۔ خلا میں جست لگائی اور ایک Blog کھول دیا اس میں اناپ شناپ کچھ بھی بھرتا گیا اس سے بھی آسودگی نہیں ہوئی تو www.Rizwanullah.com کے عنوان سے ایک سائٹ ۲۰۱۵ء میں کھول دی جو بحمدللہ اب تک کھلی ہوئی ہے۔ میری ساری کتابیں اس سائٹ پر موجود ہیں۔ زہرہ کی تصنیفات بھی اس سائٹ پر موجود ہیں۔

کلکتہ میں چوبیس سال کی صحافت کا اعمالنامہ یہاں نہیں ہے۔ اس قدر بتانا کافی ہے کہ ۱۹۷۵ء میں کلکتہ کو الوداع کہنے سے پہلے Urdu Selftought لکھ آیا تھا جسے داس گپتا پرکاشن نے شائع کیا تھا، اس سے پہلے Janson Primer ۱۹۶۲ء میں اور اس کے بعد Janson Reader لکھی تھی جسے دارالاشاعت اسلامیہ نے شائع کیا جس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

اس تمام عرصے میں خارجی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور وقوعات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ رائے سینا ہلز پر سیاست کی بساطوں پر بازیاں جاری رہیں، پارٹیوں اور افراد کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے رہے۔ ذاتی محاذ پر میری سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ کی شادی ہوگئی وہ اپنے گھر میں شاداں وفرحاں ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی میں پروفیسر ہے۔ گزشتہ سال کے اواخر میں اہلیہ کی طویل علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ چند ماہ قبل میرے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کی مختصر علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان محرومیوں کو لفظوں

میں نہیں بیان کر سکتا۔ اب اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ایک قید تنہائی ہے۔ دیکھئے اب اس تھکے ہارے مسافر کی شکستہ کشتی کو بادِ حوادث کے تھپیڑے کب اور کہاں کنارے لگاتے ہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب**.

شاہین باغ

ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے بجلی کا ایک کڑکا ہوا جسے شاہین باغ کا نام دیا گیا۔ یہیں اس کا مختصراً تذکرہ بطور حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سارا عالم اس کی تفصیلات سے آگاہ اور باخبر ہے شہری حقوق سے متعلق حکومت کے ایک قانون اور اس کے دور رس مہلک اثرات کے اندیشوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے خلاف احتجاج کا علم مسلم خواتین نے بلند کیا، اس تحریک کی ابتدا ہمارے پڑوس میں شاہین باغ میں ہوئی اس لیے اس کو یہی نام مل گیا اور اسی نام سے ملک کے گوشے گوشے میں اس تحریک کے علم بلند ہو گئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی نام سے یہ تحریک دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یورپ اور براعظم امریکہ کے شہروں میں شاہین باغ ابھر آئے۔ اس کوندے نے ساری دنیا کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ ہندوستان میں جابجا جبر و استبداد کی داستانیں لکھی جانے لگیں۔ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ حقوق نسواں کی عالمگیر تحریکیں عشروں اور قرنوں میں جو نہیں کر سکیں ناخواندہ اور خانہ نشین کہی اور سمجھی جانے والی مسلم خواتین نے وہ سب کچھ کر دکھایا۔

شاہین باغ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ موسم کی چیرہ دستیوں کے باوجود کھلے آسمان کے نیچے مہینوں نہایت صبر و استقامت اور نظم و ضبط کے ساتھ بیٹھے رہنا ایک لاثانی مثال ہے۔ مہلک حملے، عقوبت کی دھمکیاں، برقع پہن کر گھس آنے والے تخریب کاروں کی حرکتیں، ضمیر فروش نامہ نگاروں کی بداخلاقیاں یہ سب کچھ ان خواتین کے پائے استقامت کو متزلزل نہیں کر سکیں تا آنکہ کرونا وائرس نام کا عذاب نازل

ہوگیا اور شاہین باغ اجڑ گیا۔ بطنِ گیتی سے جو نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا وہ گہنا گیا۔

سوشل میڈیا

گزشتہ صدی کے آخری عشروں کے دوران الکٹرانک میڈیا میں جو انقلابات برپا ہوئے ان کے نتیجے میں ٹوٹتی بکھرتی اقدار والی جمہوریت کے چوتھے ستون کے جسم پر ایک نئی پود اگ آئی جسے سوشل میڈیا کا نام دیا گیا۔ یہ رائے عامہ کے اجارہ دار نیشنل میڈیا کے لیے ایک بڑا چیلنج نظر آرہا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ یرقان زدہ ہونے کے باوجود امید کرنی چاہیے کہ یہ بے زبان عوام کی صوت وصدا بنا رہے گا، گو اس کے لیے وسائلِ حیات تنگ اور کشمکشِ حیات سخت ہے لیکن قدرت کے لیے کچھ بڑی بات نہیں کہ پرِ کاہ کو قُلّہٗ کوہ بنادے اور ''مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کردے''۔

آخری بات

اس تحریر کے کچھ حصے لکھے ہوئے پڑے تھے، اور کچھ نوٹس بھی، لیکن ان کو مرتب کرکے ایک کتاب کی شکل دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ موجودہ حالات میں تنہائی شریک حال ہے زہرہ نے مجھے مصروف رکھنے کی حکمت کے طور پر بہ اصرار اس کام سے لگادیا۔ اس کے بعد خالد فیصل حوصلہ افزائی کرنے لگے اور کمپوزنگ کا کام بڑی چابکدستی اور خوش اسلوبی سے انجام دے ڈالا۔ ان کے برادر عزیز ساجد خلیل نے ٹائٹل بنانے کی ذمہ داری لے لی، میری سابقہ تصنیفات کے ٹائٹل بھی انہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس ٹائٹل کے لیے فوٹو میری بیٹی زبیدہ نے فراہم کیا۔ یہ مقفل ویرانہ کبھی ہمارا آشیانہ تھا۔ اس کارگراں میں تعاون کے لیے اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

پسِ تحریر

ابھی تو ہم حالیہ رفتگان کو رو پیٹ کر صبر بھی نہیں کر پائے تھے کہ سالِ گزشتہ نے

جاتے جاتے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ دل پاش پاش ہوگیا۔ اردو دنیا کا آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی بیقراری کو قرار آ گیا۔ ۲۵ ر دسمبر کو یہ حادثہ جانکاہ وقوع پذیر ہوا۔ ہم ابھی اپنے آنسو بھی نہیں پونچھ پائے تھے کہ ۲۹ ر دسمبر کو میری بیٹی زبیدہ نے داغِ مفارقت دیا۔ آہ آہ! اب آنکھوں کی نمی کسی طور نہیں جاتی۔ لیکن جینا بھی ایک مجبوری ہے سو جئے جا رہے ہیں لیکن

منے گم گشتہ یوسف را بجویم
بخوں آغشتہ چشماں را بشویم
بہ ہر چاہے نگاہم غوطہ زن است
بہ ہر کاہے تجسس در چمن است

☆☆☆

کلکتہ کی اردو صحافت
اور
میں

رضوان اللہ

قلم چوں بہ قرطاس تیشہ زند
جہانِ نہفتہ درو برکند
ز ترسیلِ اخبار عالم تمام
چو مہرِ درخشاں مجلّا کند

رضوان اللہ

پیش لفظ

ایسے میں کہ جب حرف و بیاں نوکِ زبان تک پہنچتے پہنچتے بوسیدہ ہو جاتے ہوں، جب افکار اور خیالات اسبابِ نشر و اشاعت تک بار پانے سے پہلے ژولیدہ ہو جاتے ہوں، جب خبریں خود قاری اور سامع کے لیے فرشِ راہ ہوں نہ کہ وہ ان کا جویا ہو، صحافت کے فنی، اصولی، عملی، لسانی، نظریاتی، سیاسی، تاریخی اور معاشرتی پہلوؤں اور دیگر لوازمات وملحوظات کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت بڑی دیدہ دلیری کی بات ہے۔ لیکن وہی بات کہ ناسمجھ وہاں بھی جست لگا دیتے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہوں۔ کبھی شوق بے پایاں بھی اس جسارت کا موجب ومحرک ہوتا ہے اور کبھی اپنے فن اور پیشے سے وہ عشق بھی جس کی ناعاقبت اندیشی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔

صحافت کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں جست لگانے پر اس ایقان نے بھی مہمیز کیا کہ بادِ مخالف کیسی ہی طوفان خیز کیوں نہ ہو تعمیر کی کوششیں جاری ہی رہتی ہیں، شور کتنا ہی تیز ہو اپنی بات کہنے کے لیے آواز تیز تر کرنی ہی ہوتی ہے اور مشین، یہاں میری مراد آلاتِ نشر و اشاعت سے ہے، کتنی ہی برق رفتار کیوں نہ ہو، اس کا شہسوار ہمیشہ ذہنِ انسانی ہی رہے گا تو پھر اس شہسواری کے رموز سے آگاہی کے اسباب مرتب اور فراہم کرتے رہنا صرف ایک ضرورت نہیں، ایک لازمہ ہے۔ علم پہاڑ سے بھی زیادہ بلند و باوزن ہو جائے تو بھی وہاں تک رسائی کے لئے ابجد اور اس کے اصولوں کو سیکھنے، سمجھنے اور اسے سکھانے والے کی موجودگی کے سوا چارہ نہیں۔ یہی جواز ہے ساری کتابوں کے وجود کا اور جب تک یہ جواز موجود رہے گا کتابیں

وجود میں آتی رہیں گی اور ان کی تخلیق کے لیے انسانی بصیرتوں کی ضرورت باقی رہے گی۔

موجودہ تصنیف کا سبب یہ خوش فہمی ہوسکتی ہے کہ اردو صحافت کا ہاتھی دیکھنے والے جن نابیناؤں نے اس کو بیان کرنے کی کوشش کی ان میں شاید ہمارا بھی شمار ہوجائے، لیکن کیا اس کو بیان کرنا ضروری ہے؟ ہاں۔ میں سمجھتا ہوں ضروری ہے کیونکہ عصری حالات اور معاصرین کا تذکرہ فرضِ کفایہ جیسا ہے کہ کوئی اس فرض کو انجام دے دے تو اس کا بار سب کے سر سے اتر جاتا ہے۔ اگر تصنیف و تالیف کی دنیا میں یہ روایت جاری نہ رہی ہوتی تو شاید دنیا ماضی کی تاریخ سے ناآشنا ہی رہ جاتی۔ اس باب میں میری سرگرانی پرانی ہے۔ بعض تصنیفات اور تحریریں جو وقتاً فوقتاً نظر سے گزریں وہ مہمیز بھی کرتی رہیں لیکن مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب کشاکشِ شب و روز سے دم لینے کی ذرا مہلت ملے۔

بہرحال سب سے پہلے دو باتیں عرض کردوں اول یہ کہ میں جو کچھ لکھنے جارہا ہوں وہ کلکتہ اردو پریس کے حوالے سے ہوگا۔ میرے خیال سے ہندوستان میں سب سے زیادہ چھتنار اردو پریس ہے اور ہر علاقے کے اردو پریس کے حالات و معاملات میں بہتیرے خواص کی یکسانیت کے باوجود ان کے مسائل کی نوعیت اور شدت میں بڑا فرق ہے، ان سے نبرد آزمائی اس تصنیف کے دائرۂ عمل کی سمائی سے باہر ہے، دوسرے یہ کہ میں نے اس تذکرے کو اپنی ذات کے محور سے وابستہ رکھا ہے۔ یہ ''سرِ دلبراں'' نہیں کہ ''گفتہ آید در حدیث دیگراں''۔ یہ ایک شمع سوزاں کی داستانِ حیات ہے جو اپنی سوختہ سامانی سے ہر صبح کو جلوہ افشانی عطا کرتی ہے۔ اس راست بیانی کی ایک خاص وجہ یہ احساس ہے کہ جو شخص خود کسی کشاکش میں مبتلا اور شریک رہا ہو اس کے بیان میں معروضیت کی امید نہیں کی جاسکتی اس لیے کیوں نہ پہلے ہی یہ بات صاف کردی جائے کہ جن حالات و واقعات کا میں تذکرہ کر رہا ہوں انہیں میں نے جس طرح دیکھا، برتا اور سمجھا اسی طرح بے لاگ بیان کر رہا ہوں۔

جو داستان اس کاغذی پیرہن میں مستور ہے اسے کئی طرح بے لاگ بیان کیا جا

سکتا ہے۔ اسے آزادیِ وطن کے بعد تقریباً نصف صدی پر محیط ایک مصلوب زبان کی مضمحل صحافت کا سپاٹ میزانیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے بے دست و پا انسانوں کے بے زبان ترجمان کا بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے دو جراحت خوردہ طبقوں کی آپسی کشاکش کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک کو مالک اور دوسرے کو ملازم کہنا ایک مجبوری ہے۔ اس پوری داستان کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے یعنی پہلا پتھر کا دور جب لیتھو مشینیں اردو اخباروں کو زندگی کی بھیک دے رہی تھیں اور دوسرا ننئی جست کا دور جب آفسیٹ مشینوں نے تیز گام ہونے کے لیے حدی خوانی کی اسی راہ میں اگلا پڑاؤ وہ ہے جہاں کمپیوٹر کمپوزنگ روایتی خوش نویسی سے ہم آغوش ہوئی۔ اسی طرح اس کہانی کی ایک اور تقسیم ممکن ہے یعنی نصف اول کو کلکتہ میں 'آزاد ہند' اور 'عصرِ جدید' کی قیادت کا دور کہا جا سکتا ہے تو نصف ثانی کو 'اخبارِ مشرق' کی پیش رفت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں اس کہانی کو اس میں شریک ایک کردار کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ کردار میں خود ہوں۔

اس اعتبار سے بھی کہانی کو تقریباً برابر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک حصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک اور دوسرا ۱۹۷۶ء سے جاری۔ ۲۴-۲۵ برس پر محیط پہلے مرحلے کے دوران میں بذاتِ خود کلکتہ کی بساط پر موجود، فعال اور سرگرم تھا۔ اس کی تفصیلات تو بہت ہیں لیکن اسی حد تک بیان کرنے کی کوشش کروں گا جس کا تحمل یہ تصنیف کر سکے۔ مزید براں دہی دور اردو صحافت میں صف آرائیوں کی ابتدا، صحافیوں کی عمومی صنعت کاری اور اردو صحافت کے معاملات میں غیر اردو بلکہ اردو مخالف صحافیوں کی مداخلت کے آغاز کا زمانہ بھی ہے۔ ایسے میں ہماری رہنمائی کے لیے ماضی کی نظیریں بھی نہیں تھیں۔ اس زمانے میں ہماری پریشانی اور بے بسی کا آج اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اردو صحافت سے میری وابستگی کا دوسرا دور اس اعتبار سے عجیب و غریب ہے کہ وہ بالواسطہ ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک براہِ راست تھا یعنی میں امریکن سنٹر دہلی میں اردو ایڈ

یٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے کلکتہ کے اخباروں اور بیشتر صحافیوں سے مستقل رابطے میں رہا لیکن جائے وقوع پر عدم موجودگی کی وجہ سے اس رابطے میں پہلی سی گہرائی نہ تھی۔ یہ فیض صنعت کاری ہمارے داخلی اور باہمی تعلقات میں جو تلخی اور کشیدگی آ گئی تھی اس سے ہمارے نئے حالات معرا اور مبرا تھے، ان تعلقات میں ایک نرمی اور خوش سلیقگی آ گئی تھی دوسرے یہ کہ کسی ایک اخبار سے وابستگی کی تخصیص باقی نہ تھی سارے اخباروں اور ان کے صحافیوں سے یکساں تعلقات ہو گئے تھے۔ ان اخباروں کی باہمی مسابقت یا ان کے اندر صنعتی کشیدگیوں اور کشاکشوں سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا۔ جب ایک خاص فاصلے سے اور ایک بے لاگ زاویئے سے ان اخباروں کو دیکھنے لگا تو بس ایک ہی مطمحِ نظر رہ گیا تھا اور وہ تھا اردو اخباروں کا ارتقا، صحافتی معیاروں کی ترقی۔ چونکہ اس دوران مجھے انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے اخبارات اور صحافیوں کو بھی دور و نزدیک دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا تو مشاہدے میں وسعت پیدا ہوئی اور مختلف صحافیوں سے موازنے کا موقع بھی ملا۔

اس موازنے کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو کسی معینہ وقت یا مقام پر گنے چنے اداروں کے معائنے یا افراد سے ملاقاتوں پر مبنی نہیں بلکہ ایک عرصے تک مشاہدوں اور ملاقاتوں کے بعد قائم ہونے والے تاثرات پر مبنی ہے۔ پوری کیفیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی ادارتی جس میں افراد اور ان کی تحریریں شامل ہیں، دوسرے انتظامی شعبہ اور اس کی کارفرمائیاں۔ ان دونوں کی اجتماعی کوششوں کا حاصل اخبارات ہیں۔ ہمارے اردو اخباروں کی ظاہری ہیئت سب پر آشکارا ہے۔ پھر یاد دلا دوں کہ فی الحال میرے پیشِ نظر کلکتہ کے اردو اخبارات ہیں، گو تذکرے کا انداز عمومی ہے، یوں اس تخصیص اور عمومیت کے درمیان کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ لیکن میں جس آشکارا ہیئت کا ذکر کر رہا ہوں اس کا جمود ۱۹۸۰ء میں خدا خدا کر کے ٹوٹا جب کلکتہ کے آفاق پر 'اخبارِ مشرق' طلوع ہوا۔ کلکتہ کا یہ پہلا اخبار تھا جس کی اشاعت آفسیٹ پریس پر شروع ہوئی۔ بانیِ اخبار وسیم الحق صاحب ۱۹۷۴ء

سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے جس کا مجھے علم تھا۔ ۱۹۷۵ء آتے آتے انھوں نے مشین وغیرہ بھی درآمد کر لی لیکن عین اسی اثناء میں ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔ اس طرح کسی نئے اخبار کی اشاعت شروع کرنے کے لیے حالات ناسازگار ہوگئے اور وسیم صاحب کو اگلے کئی برسوں تک انتظار کرنا پڑا۔ 'آزاد ہند' دو تین لیتھو مشینوں پر چھپ رہا تھا اس لیے کہ ایک مشین ضرورت کی تکمیل کے لیے ناکافی تھی۔ شاید احمد سعید صاحب کو یاد نہ ہو، میں نے دو ایک بار اشارتاً ان سے کہا تھا کہ آفسیٹ مشین کا بندوبست کریں کہ وہ نئی بلڈنگ بنانے سے زیادہ ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اگر میں 'آزاد ہند' کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا تو دوسری طرف وسیم صاحب میرے مخلص اور آزمودہ دوست تھے۔ بہر حال 'اخبارِ مشرق' کی اشاعت کے بعد 'آزاد ہند' کے لیے بھی آفسیٹ پریس کا بندوبست کرنا ایک لازمہ بن گیا۔ اس طرح کلکتہ کے اردو اخباروں کی ظاہری ہیئت میں نکھار کا سلسلہ شروع ہوا اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

جہاں تک ادارتی شعبے میں شخصیات اور ان کی تحریروں کا تعلق ہے، ان کے معیاری ہونے میں مجھے نہ پہلے شک تھا نہ اب ہے۔ یہ دیکھ کر ایک طرح کے فخر کا احساس ہوتا تھا کہ ہمارے صحافیوں کی زبان سکہ بند، منجھی ہوئی اور دوسری دیسی زبانوں کے مقابلے میں معیاری ہے۔ اب ایک عام انحطاط کا دور ہے ٹی وی چینلوں کی بھگدڑ نے زبان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس سے ہمارے اردو صحافی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہاں تحریروں کے موضوعات یقیناً اکثر و بیشتر بندھے ٹکے ہوتے ہیں ان میں تنوع اور پھیلاؤ کی کمی ہے اس کے لیے ان صحافیوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس کا سیدھا تعلق ہمارے اخباروں کی مالی حیثیت سے ہے جسے انتظامیہ کی تنگ دلی نے تنگ تر کر دیا ہے۔ میں اپنے ہم پیشہ صحافیوں کے متعلق وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''۔ لیکن یہ بتائے بغیر میری بات نامکمل رہ جائے گی کہ اگر اپنے صحافیوں کے معاشی حالات بہتر بنانے کی تدبیر نہ کی گئی تو بہتری کی کسی کوشش کا حسبِ خواہ بارآور ہونا مشکوک رہے گا۔

اعترافات

دماغ میں اس تصنیف کی کھچڑی ایک عرصے سے پک رہی تھی۔اس اثناء میں جس کسی سے اس کا ذکر کیا اس نے کسی نہ کسی طور میرے ارادے سے اتفاق کیا، اس میں کسی کی جیب سے کیا جا تا تھا لیکن عزیز گرامی پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک ملاقات میں میرے خیال کی تائید کچھ اس طرح کی گویا میں نے اس کام کو انجام نہ دیا تو ہماری صحافت کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد دوسری ملاقات میں کتاب کا ٹائٹل بھی انھوں نے تجویز کر دیا ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' مجھے یہ ٹائٹل عجیب سا لگا لیکن پروفیسر شہریار اس وقت موجود تھے۔انھوں نے اس تجویز کی پرزور تائید کی اس کے بعد میرے کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر ہمارے سر میں اس کی ہوا ایسی بھری کہ ہم اس ہفت خواں کو سر کرنے کی مہم پر چل پڑے۔مشکل یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے لئے ممنونیت کا اظہار کیسے کروں جبکہ وہ خود اس تصنیفی کاوش میں شریک ہوگئے۔رہی یہ بات کہ ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے'' تو قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی رہیں اور اللہ کے بندے دست گیری کرتے رہے۔رفیق دیرینہ قیصر شمیم صاحب، وائس چیئرمین مغربی بنگال اردو اکاڈمی، نے بہت بڑی معاونت کی ورنہ اس تصنیف کی بیل واقعی منڈھے نہ چڑھی ہوتی۔نومبر ۲۰۰۴ء کے اواخر میں وہ اپنی مجلسِ صدارت کے ساتھ دہلی آئے۔ یہ تجدیدِ ملاقات بارہ تیرہ برس بعد ہوئی تھی، اس وقت تک ہماری اس تصنیف کا بنجارہ کئی پڑاؤ آگے نکل چکا تھا۔انہی سے معلوم ہوا کہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تصنیف ''بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ'' کو رئیس جعفری کی نظر ثانی کے بعد مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شائع کیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے واقعی عید کی خوشی جیسی تھی۔اب عیدوں میں بھی وہ خوشیاں کہاں رہ گئی ہیں! میری گزارش پر انھوں نے کلکتہ واپسی کے بعد پہلی فرصت میں اس کتاب کی ایک جلد بطورِ ہدیہ ارسال کردی۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔اس کتاب کے مندرجات نے بہت ساری بھولی بسری یادیں تازہ کردیں۔اس سے ناموں اور

تاریخوں کی درستگی اور اصلاح میں بڑی مدد ملی۔ کسی معاملے میں دور افتادہ لوگوں سے معلو مات حاصل کرنا مشکل اور صبر آزما کام ہوتا ہے۔ اس راہ میں محبِ صادق وسیم الحق، ایڈیٹر 'اخبارِ مشرق' سید منیر نیازی، نیوز ایڈیٹر 'آزاد ہند'، کمال جعفری، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ اور اشہر ہاشمی، یو این آئی، اردو نیوز سروس نے دستِ تعاون دراز کیا۔ ان سب کا رہینِ منت ہوں، خصو صاً عزیز گرامی محبوب الرحمٰن فاروقی سابق ایڈیٹر ماہنامہ 'آجکل' کا، انھوں رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی رپورٹیں فراہم کرنے میں دست گیری کی اور برادرم تسکین واحدی کا جو سبکدوشی کے بعد اپنے وطن موضع شیخ پور، ضلع بلیا میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے ایک بزرگ رفیق عابد زاہدی سے مل کر مطلوبہ معلومات حاصل کر کے مجھے ارسال کیں۔

ابراہیم ہوش ایڈیٹر 'آبشار' کی خودنوشت سوانح حیات روزنامہ 'اقراء' کلکتہ میں ۱۹۸۳ء میں قسط وار شائع ہوئی۔ اسی طرح رئیس الدین فریدی ایڈیٹر 'روزانہ ہند' کی خود نوشت سوانح حیات 'آزاد ہند' کلکتہ میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں قسط وار شائع ہوئی، ان دونوں سلسلوں کے کچھ تراشے پرانی فائلوں میں مل گئے۔ ان سے بھی متعدد واقعات اور تاریخوں کی تصحیح اور درستگی میں مدد ملی۔ ان اصحاب کے تذکرے اس تصنیف میں شامل ہیں۔

اسی وقت اس تصنیف میں کمیوں اور فروگزاشتوں کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ صحافت کی خواہ تاریخ ہو، تذکرہ یا فن، ان کے موضوعات اور مضامین زندہ اور نمو پذیر ہوتے ہیں اور ہمیشہ تازہ کاری کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے، ہر تصنیف کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے نئی اور بدلے ہوئے حالات و واقعات سے ہم آہنگ تحریروں اور تصنیفوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تصرف اور اضافہ تازہ واردانِ بساطِ فن کی ذمہ داری ہے۔ سو ان اعترافات کے ساتھ میں اپنے حصے کا کام کر چلا۔

رضوان اللہ

اوراقِ مصور

رضوان اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقا کہ ایں ضعیف نہ تابِ کلام داشت
ایں ہم عطائے اوست نوائے دوام یافت

از بہر ہم نوائی بسوئے قلم شتافت
قرطاس را برائے قلمرو نگاہ داشت

دُر ہائے شاہوار دراں مَرغزار کاشت
نو طرزِ بوستانے کہ رضواں میاں گزاشت

رضوان اللہ

مقدمہ

کلکتہ کی برسات معاذ اللہ! اگر ذرا یکسوئی ہوتو ذہنی انبساط کے جھولے میں فکر کی پینگیں اور اگر گھر دفتر کے درمیان ہوں تو تر ددات کے ہلکورے۔ ذرا فرصت میسر ہوتو ہر منظر، کیا کوچہ و بازار کیا شاہراہ وسبزہ زار ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست''۔ بنگال کے شبستانوں کی شمعِ محفل رجنی گندھا کی قطاروں کی طرح کہیں نازک بدناں اپنے سراپا کو سمیٹے، کہیں بگلوں کی طرح سرافراز، کہیں بیزار بابوؤں کی قطار، لیکن زندگی کے ایک معمول کے طور پر اس کیفیت سے نبرد آزما رواں دواں۔ ایسی ہی ایک برسات تھی جس میں گھنٹے بھر کی بارش کے بعد چار چھ گھنٹے کے لیے زندگی جامد ہوجاتی ہے۔ اس برسات کو بھی اب تیس برس سے زیادہ ہونے کو آئے۔ میری ڈائری میں وہ تاریخ ۴ رستمبر ۱۹۷۰ء درج ہے۔ بارش کی جھڑی نہ جانے کب سے لگی ہوئی تھی، رکنے کو ہی نہ آتی تھی۔ اتفاقاً اوپر پٹنی پر نظر گئی جہاں کتابیں میری روزمرہ کی بے ہنگم زندگی ہی کی طرح بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ پر ہی تر بتر ہورہی ہیں۔ ان کو بچانے کی بس ایک ہی صورت تھی کہ بارش تھمنے کی دعا کی جائے۔ لیکن دعا سے پہلے بے بسی کے عالم میں یہ جملہ سرزد ہوا ''پانی برس رہا ہے کہ جاں ہے عذاب میں''۔ شاید برسات کے زیر اثر طبیعت پر موزونیت کا غلبہ تھا اس لیے دوسرا جملہ بھی سرزد ہوا ''پانی تمام رینگ گیا ہے کتاب میں'' پھر ان جملوں کی موزونیت کے پیش نظر ان پر شعر کا گمان ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ مصرعوں کی جھڑی لگ گئی۔ طبیعت ہر فکر مندی

سے فرار کی راہ تلاش کر لینے کی عادی ہے۔ چنانچہ وہ کتابوں کے انجام سے بھی بے خبر ہوگئی اور خواب سے بھی بے خبر ہو کر خیالوں میں کھوگئی۔

اگلی صبح کو دیکھا تو کچھ اشعار اکٹھا ہو کر ایک نظم کے پیکر میں جلوہ گر تھے۔ دراصل وہی اس مثنوی کا تخم تھا جسے میں نے اپنی عادت کے مطابق ایک لفافے میں ڈال دیا اور بھول گیا۔ لیکن وہ تخم کلکتہ کی حیات افزا فضا میں زندہ رہا اور برگ و بار لانے کے لیے گرمی نفس کے موسم کا منتظر رہا۔ دریں اثناء اسی لفافے میں کچھ اور رقعات اکٹھا ہوتے گئے۔ بالآخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ کاغذات کو الٹتے پلٹتے ان پر بھی نظر پڑی۔ یہ واقعہ ۱۹۷۲ء کا ہے۔ اسی روز یہ گمان گزرا کہ اس نظم میں طوالت کے خاصے امکانات موجود ہیں۔ اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت چھوٹی چھوٹی نظمیں وقتاً فوقتاً صادر ہوتی رہیں جو محض بیانیہ تھی۔ تب یہ خیال ہوا کہ انہیں اکٹھا کر کے کبھی ایک مثنوی کی شکل میں مرتب کر لیں گے۔ لیکن ہنگامۂ حیات نے اتنی مہلت نہ دی کہ یکسوئی کے ساتھ اس راہ میں کچھ کام کر سکوں۔ کاروانِ فکر ابھی ناہموار رہگزاروں سے گزر رہا تھا کہ شہر عزیز سے جدائی کی گھڑی آ گئی۔

ہر کسی کو زندگی میں کبھی نہ کبھی چھوٹی بڑی، ہلکی بھاری جدائیوں کا تجربہ ہوتا ہی ہے۔ اس لیے ان احساسات اور کیفیات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے جن سے کوئی حساس شخص اس شہر کو چھوڑنے کے بعد گزرا ہوگا جہاں نوجوانی اور جوانی کے چوبیس برس، شب ورز، جی ہاں شب وروز، اس نے گزارے ہوں گے۔ پھر ایک زمانہ گزر گیا نئے حالات سے نبرد آزمائی میں۔ کچھ عرصہ بعد جب زندگی پھر ڈھرے پر آ گئی اور شہرِ عزیز کی باز دید کی نوبت بھی آئی تو فکر نے ماضی کے تانے بانے درست کرنے شروع کئے، پرانی پوتھیاں بھی کھولی گئیں۔ لیکن اسی وقت ایک ذاتی تجربہ بھی ہوا۔ وہ جو نظم کا ایک سادہ اور بیانیہ انداز تھا جیسا کہ مثنویوں میں بالعموم ہوا کرتا ہے، وہ اپنی فطری حالت میں برقرار نہ رہا۔ فکر میں ایک ایسی حرارت آ گئی جو بچھڑے ہوؤں سے ملنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، پھر اظہار میں جذباتیت،

طربیہ اندازِ بیان اور مبالغہ جیسا کہ اکثر شاعری کے عناصر میں ہوتا ہے اور شاید تصنع بھی در آیا۔ لیکن ان تصرفات کے باوجود وہ حقیقتیں برقرار رہیں جن کا بیان مطلوب تھا۔ چنانچہ اس مثنوی کے اجزاء کوئی تیس برس پر محیط ہیں۔ اس طویل عرصے میں پورا وجود جس نشیب وفراز سے گزرا ہے، جس میں طبعی ناآسودگیاں اور فکری جولانیاں بھی شامل ہیں، ان کا مترشح ہونا بالکل طبعی اور فطری امر ہے۔

یادوں کے نہاں خانے میں سجائے ہوئے نقوش روحانی اور نورانی ہوتے ہیں، مادی کدورتوں سے پاک ہوتے ہیں۔ فصلِ زمانی ومکانی کے سفر کے دوران رگڑ کر تلخیوں کی زنگ اگر بالکل صاف نہیں تو ہلکی ضرور پڑ جاتی ہے۔ دوسری طرف عشق اپنے آغاز کے بعد گزرنے والے وقتوں کے ساتھ ساتھ دل کی گہرائیوں میں اتر کر جاں گزیں اور راسخ ہوجاتا ہے۔ وطن سے محبت کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اپنی جگہ پر تلخ حقیقتوں کا سامنا ہوتا ہے، ناآسودگیاں ہوتی ہیں لیکن وطن سے دوری کے بعد یہ سب کچھ نہیں ہوتا، صرف وطنیت کا لطیف احساس باقی رہتا ہے اور اس سے دوری کی کسک۔ کلکتہ کے ساتھ میرا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا۔

میں کہ بے وطنی کا پروردہ جس نے وطنیت کے شدید احساس کے باوجود جو کہ اہلِ مشرق کا ایک خاصہ ہے، بے وطنی کے عالم میں شعور کی آنکھیں کھولیں، جس دھرتی کو صبح شام اپنے قدموں سے ناپتا رہا اسی کو وطن سمجھ کر اس سے لپٹ گیا۔ جن لوگوں کو آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا، انہی کو ہم وطن سمجھ کر تیج تہوار میں انہی کے گلے سے لگ لیا۔ یوں میرے اوطان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ لیکن وطنیت کا وہ احساس جو نہاں خانۂ دل میں راسخ ہوتا ہے، جس کی تشریح وتاویل مشکل ہے، کسی نہ کسی طور اپنے اظہار کے لیے بے قرار تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ جذبۂ عشق جو اپنے اظہار کے لیے اصنام تراشتا ہے پھر انہی کا پجاری بن جاتا ہے یا جو کسی پیکرِ خیالی کو دل میں چھپائے اس کی قصیدہ خوانی کیا کرتا ہے یا جو کسی نامعلوم ونادیدہ حقیقت کی تلاش میں انسانوں کی آبادی سے بیزار وگریزاں راہ بیاباں اختیار کرتا ہے،

وہ جذبۂ صادق ساری حسن کاریوں کا محرک اور اصل ہے۔ میرے معاملے میں شاید اس جذبے نے اپنے اظہار کے لیے شہرِ عزیز کا انتخاب کیا جو بالکل غیر شعوری ہے۔ یہ کہاں تک حقیقی ہے اور کہاں تک علامتی میرے لیے اس کا تعین ممکن نہیں ہے۔ جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے، سامنے ہے۔

اس اظہار کے لیے مثنوی کے قالب کا انتخاب، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اتفاقی ہے لیکن اس اتفاق کو اردو ادب کی روایات سے تقویت ملی ہے۔ ان روایات میں اس کے فارسی مآخذ یا مراجع بھی شامل ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح غزل فارسی کے ساتھ اردو میں درآتی، اسی طرح مثنوی بھی انہی راہوں سے گزرتی ہوئی ہمارے مَرغزاروں میں شگوفہ کاریوں کا موجب ہوئی۔ فردوسیؔ اور رومیؔ کی روایتوں کی امین کو ہندوستان کی سرزمین شاید غزل کی بہ نسبت زیادہ مانوس ملی ہوگی کیوں کہ یہاں منظوم داستانوں کی روایت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ پھر اربابِ فن اور اہلِ ذوق نے ان دونوں تقریباً ہم رنگ روایتوں کو آمیز کر کے ایسی ہیئتیں تیار کیں جن میں شاہنامۂ فردوسیؔ کے رزمیہ اور مثنوی رومیؔ کی روحانیت کے اجزاء کہیں الگ الگ اور کہیں باہم شیر و شکر نظر آئے اور نئے نئے تجربات کے چمن کھلائے، موضوعات ومضامین کی کثرت اور تنوع سے بے پناہ وسعت پیدا ہوئی یعنی معاملاتِ حسن وعشق سے لے کر شہر آشوب اور مرثیوں تک جو طربیہ اور حزنیہ کا، نیاز واحترام کا، خلوص بے پایاں کا، منظر کشی کا لاثانی مرکب ہیں۔ ان کے علاوہ وہ مثنویاں جو حُب الوطنی کی آئینہ دار ہیں یا وہ جو دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے بساطی یا آلام وشادمانیوں کی یا معاشرے کی روایات کی ترجمان ہیں۔ اس سلسلہ کو ہجویات ومضحکات تک طول دیا جا سکتا ہے۔ اسی وقت یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی میں محض عروضی قیود کے علاوہ موضوع کے انتخاب واختیار کی، تعداد اشعار کی، بہ الفاظِ دیگر جولانی فکر کی جو آزادی ہے، میری افتادِ طبع سے میل کھاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے مختلف نظموں کو یکجا کر کے انہیں مثنوی

کا نام دینے کا خیال آیا۔ جہاں تک عروضی قیود کا تعلق ہے ان سے پہلے بھی بے بہرہ تھا اور اب ایک ہی بحر میں سیکڑوں اشعار کہہ ڈالنے کے باوجود اس کی واقعی تفہیم سے اتنا ہی عاری ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس راہ میں ذہن کو زیر باری کی زحمت ہی نہیں دی۔ بعض احباب سے جب اپنے ارادے کا اظہار کیا تو انہوں نے مثنوی کی بحروں کی تحدید کے سانپ بچھو دکھائے۔ لیکن اس وقت تک ہماری شاعری کا بنجارہ ان خارزاروں سے بے نیازانہ گزر چکا تھا۔ آدمی جتنا کم آگاہ ہوا تنا ہی سکھی رہتا ہے۔

شاید فنونِ لطیفہ میں سنگ تراشی ہی وہ صنف ہے جس میں فن کار اپنے تصور کی مادی ترجمانی کرتا ہے۔ بس کسی پیکر جمال میں روح پھونکنا اس کی دسترس میں نہیں ہوتا۔ غالبًا شاعر ساری قدرت کلام کے باوصف اس منزل تک نہیں پہنچ سکا ہے جہاں زبان اس کے واقعی احساسات کی ترجمانی کر سکے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔ اس لیے میں اس مثنوی میں کسی ادعا سے قاصر ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وقتاً فوقتاً اپنے احساسات کی منظوم ترجمانی کی، ان کو رکھتا گیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اتنی مدت کے دوران جس کا احاطہ کیا گیا ہے، دنیا نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جس شہر کا مشفاّ و مجلّٰی نقش ذہن پر مرتسم تھا، اس کا حلیہ بنتے بگڑتے نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا۔ خود ہمارا حلیہ نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا جسے جاننے پہچاننے والے زمانے کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ اب نہ وہ ہمیں جانتے پہچانتے ہیں، نہ ہم ان کو۔ لیکن باایں ہمہ ہمیں اپنے کام سے کام ہے، وہ کام جس کی نیت کسی مقبولیت کی گھڑی میں باندھی گئی ہوگی۔

''زندگی میں موت کے کھٹکے'' کی طرح چاہت میں جدائی کا کھٹکا لگا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ذوقِ جمال نے اپنے اظہار کے لیے شہرِ عزیز کو تاکا اور اس طرف توسنِ فکر کو دوڑانے کی ٹھانی تو اس کی پہنائیوں کا قیاس کر کے طبعِ مضطرب نے فرار کی راہ اختیار کی۔ مگر کبھی کبھی طبیعت کو ذرا مطمئن پا کر اجزائے لخت لخت کو جٹا تا گیا۔ لیکن وسوسوں کی یورش

ہمیشہ تعاقب میں رہی اور ڈراتی رہی کہ یہ روگ تمہارے بس کا نہیں، یہ بیل منڈھے نہیں چڑھنے کی۔ لیکن تخلیق کار کو اپنی تخلیق کے تئیں ایسا عشق ہوتا ہے جو اسے ہرہفت خواں سے گزرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ سوشہرِ عزیز کی وہ چاہت جسے ذوقِ جمال نے اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا تھا تخلیق سے عشق میں مبدل ہوکر دوآتشہ ہوگئی اوراس کی تکمیل کی راہ میں حائل ہر مشکل سے نبردآزما ہونے کے لیے خلقی توانائی میں مبدل ہوگئی۔ یہاں تکمیل سے میری مراد موجود مواد کی ترتیب وتزئین سے ہے ورنہ کسی ادبی تخلیق میں تکمیل کو محض ایک مفروضہ کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال اس تکمیل یا مفروضے تک پہنچنا ایک بھول بھلیاں سے گزرنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ موضوعات میں بڑا تنوع تھا اور ایک ہلکا پھلکا تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کی کوشش بھی تھی۔ اس طویل نظم میں تمہید وتشبیب اور اختتامیہ قسم کے اجزاء کا التزام کر کے روایات کو کچھ برت لینا تو نسبتاً آسان تھا۔ لیکن شہر کے منظر نامے اوراس کی گونا گونی کو تاریخی تسلسل سے ہم آہنگ کرنا مشکل تھا۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جابجا اس تاریخی تسلسل سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک عنوان کے ساتھ کسی واقعہ، کسی منظر یا کسی قطعۂ فکر کو داخل کر دیا اور اپنی طبیعت کو اس وقتی بے ربطی یا اصل دھارے سے برائے نام گریز پر آمادہ کرلیا۔ باایں ہمہ یہ مثنوی ایک بے پناہ دنیا کی معمولی سے معمولی عکاسی بھی نہیں کرتی۔ یہ ہم جیسے بے مایہ کے بس کی بات بھی نہیں۔ اس کے لیے شناورانِ بحرِ ذخار کو بھی ایک زندگی درکار ہوگی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک بے مایہ کا حقیر سا نذرانہ کہا جا سکتا ہے۔ بے بساطی کے طنز سے بچنے کے لیے یہ برملا اعتراف ضروری ہے۔

اسی وقت یہ اعتراف بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے بعض اجزاء جو ابتداءً منظوم ہوئے تھے، جناب نشؔور واحدی صاحب کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ غالباً ۱۹۷۴ء میں وہ کلکتہ تشریف لائے تھے تو میں نے دوتین نظمیں جو اس وقت تک ہوچکی

تھیں، انھیں دکھائیں اور اپنے آئندہ ارادے کا بھی ذکر کیا۔ موصوف نے اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس سے پہلے بھی چند غزلیں جو ہرا ردو خواں کی طرح شوقیہ کہہ ڈالی تھیں، انہیں پیش کر چکا تھا۔ لیکن ان کی حوصلہ افزائیوں کے باوجود اس راہ پر اپنی گاڑی آگے نہیں بڑھی۔

اب جب کہ دہلی میں کوئی ربع صدی گزار چکا، اس کی بوباس میرے وجود میں رچ بس گئی تو اس سے ایک تعلق کا احساس بالکل فطری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی طبعی کم آمیزی یا کاہلی کی بناء پر اس شہر کے بے پناہ فاصلوں کو طے کر کے یہاں کے ہنگامۂ حیات سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ لیکن کسی دھرتی سے سبزۂ بے مایہ کا تعلق بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا کہ شمشاد وچنار کا۔ کیونکہ وہ بھی اسی مٹی اور ہوا پانی کا پروردہ ہوتا ہے۔ لیکن میرؔ و غالبؔ کے اس شہر کو خراج پیش کرنا میرے لیے بہت چھوٹے منہ اور بہت بڑی بات کے مترادف ہوگا۔ گو یہ شہر وہی نہ رہا جوان بزرگوں کے زمانے میں رہا ہوگا جب اس کے کوچے ''اوراقِ مصور'' رہے ہوں گے۔ وہ معاشرت تو یقیناً نہیں رہی، جس کی بربادی کے وہ ماتم گزار تھے۔ لیکن اب اس شہر کی آب وتاب میں یقیناً وہ اضافے ہوئے ہیں جو اسے دنیا کی عظیم الشان راجدھانیوں کا ہمسر بناتے ہیں۔ اس سے بے نیازانہ گزر جانا محال ہے۔ چنانچہ وہ چند مختصر نظمیں جو مختلف موقعوں پر لکھی گئیں، اس شہر کو خراج کے طور پر اس تصنیف میں شامل کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جی نے کہا کہ میرؔ کے فرمائے ہوئے دو لفظوں پر مشتمل فقرے کو کیوں نہ اس کتاب کا عنوان بناؤ۔

محولہ بالا نظموں میں سے ایک بعنوان ''دلّی نامہ'' میری کتاب ''بے ادبیات'' میں شامل ہے۔ یہ قاآنیؔ کی پیروی میں لکھی ہوئی ہلکی پھلکی نظم پرانی اور نئی دلّی کی گوناگوں زندگی پر سرسری تبصرہ ہے۔ اس میں کہیں تیکھے اشارے بھی ہیں لیکن لفظوں کی ترنگ ان کی ممکنہ خلش کو بہالے جاتی ہے۔ دوسری نظم ''شہراندرشہر'' دہلی کے ماضی وحال پر ایک تاثراتی تبصرہ ہے اور بس۔ ایک اور نظم ''شہرشورش زدہ'' بھی ان تاثرات کا اظہار ہے جو کسی حسین اور حسن

آفریں شہر کا افسردہ اور پرملال چہرہ دیکھنے کے بعد فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ مجھے احساس ہے کہ مجھ پر دہلی کا بھاری قرض ہے۔ اب یہ بات توفیق کی ہے۔ دیکھیں اس قرض سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت کب اور کس طرح بنتی ہے۔ فی الحال میرتقی میرؔ کی ایک غزل کے اشعار پر تضمین کو اس کتاب میں شامل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

رضوان اللہ

ہمارے گاؤں ہمارے لوگ

رضوان اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسرم گزشت بگوئمت چہ خجستہ بود دیارما
ہمہ کشتِ زر ہمہ باثمر کہ خزاں ندیدہ بہارما
نہ بہشت بود بریں زمیں ولے ما فدا و فریفتہ
ہمہ تلخ و ترشِ زمانہ ہم نتواں شکست خمارما

دیباچہ

کہا جاتا تھا کہ اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ممکن ہے تب یہ بات درست رہی ہو،لیکن اب وہ گاؤں نہیں رہے جہاں میں زندگی بھر جہاں گردی کے باوجود اب بھی بستا ہوں۔اب وہ گاؤں بدل رہے ہیں،ان کا چہرہ،ان کی تہذیب،معاشرت،زبان،رہن سہن سب کچھ بدل رہا ہے۔اب گاؤں شہر بنتے جارہے ہیں،اجنبیت بڑھتی جارہی ہے۔لوگ خود اپنی پہچان بھولتے جارہے ہیں۔گاؤں کی مٹی پانی سے بنے ہوئے دیئے شہروں کو روشن کرتے تھے،وہیں سے ابھرے ہوئے خام کار شہروں کو دانشوری عطا کرتے تھے۔شہری دانشوری کا خام مال تو اب بھی گاؤں ہی سے آتا ہے لیکن شہری تہذیب کی کھوٹ اس میں وہیں شامل ہوتی جارہی ہے۔فلمیں اور ٹی وی چینل گاؤں کے مناظر بطور تفریح پیش کرتے ہیں لیکن کاغذ کے ان پھولوں میں اپنائیت کی وہ خوشبو کہاں جس میں ہمارا ذہنی وجود اب تک بسا ہوا ہے۔خوشبو کا تعلق تو احساس سے ہے یہ بتانے دکھانے کی چیز نہیں لیکن جی نہیں مانتا، اسے اپنی تحریروں کے ذریعہ بتانے کی سعی رائیگاں کیے جارہے ہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے عالمِ انبساط میں کوئی بے نیازانہ گنگناتا جائے کوئی سنے یا نہ سنے۔یہ سعیِ رائیگاں اس لیے بھی ہے کہ اب لوگوں کو پڑھنے پڑھانے کی فرصت نہیں ہے نہ ضرورت ہی ہے۔سب کچھ چھوٹے بڑے پردوں پر پڑھا پڑھایا جاتا ہے اسی مناسبت سے کتابوں کی ضرورت بھی کم ہوتی جارہی ہے۔تاہم آرائش کے لیے کتابوں کی ضرورت کسی قدر باقی ہے۔ممکن ہے اسی بہانے ہمارے گاؤں کی کچھ جھلکیاں جھانکنے والوں تک پہنچ جائیں۔

اس تصنیف کا خاص مقصد ایک اور ہے۔ ان لوگوں کا کچھ قرض ادا کرنا جن کو میں نے قریب سے دیکھا، جن سے آدابِ زندگی اور جہدِ حیات کا سلیقہ سیکھا، جن سے اپنے کمزور وقتوں میں جینے کا حوصلہ ملا۔ ان میں قابلِ احترام بزرگوں اور اصحابِ علم و فضل کے علاوہ بہت معمولی لوگ بھی شامل ہیں جن کے کردار کی اہمیت پر عام طور سے نظر نہیں جاتی۔ تاہم یہ نہ تو سارے مخلصوں اور مہربانوں کی مکمل فہرست ہے نہ ہی ان کے احسانات کا وہ صلہ ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ بس ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔

غم اس بات کا ہے کہ اسلاف کے قابلِ ذکر آثار اس طوفانِ نوح کی نذر ہو گئے جو ہمارے سروں پر سے گزرتا ہوا ہماری تہذیب کے تار و پود اس طرح بکھیر گیا کہ اب نہ انھیں اکٹھا کیا جا سکتا ہے نہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اسے تقسیمِ وطن کا نام دیا گیا۔ جانے والے بیش بہا اثاثے کے طور پر اسلاف کی تحریریں بھی لے گئے لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ زندگی کے جس گرداب کی طرف وہ جا رہے ہیں اس میں وہ آثار اور اثاثے تو درکنار خود اپنے وجود کو سنبھالے رکھنا دشوار ہوگا۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کی خوش قسمتی سے جان و مال سب بچے رہے ہوں گے لیکن ہم جن اثاثوں کی بات کر رہے ہیں ان میں سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا غم ہے۔

یہاں دوستوں کا بھی کوئی خاص تذکرہ نہیں ہے۔ اس بارے میں میں نہایت بدقسمت ہوں۔ دوست بہت کم بنے یا کم بنائے، ان کی صحبتیں بھی مختصر ہی رہیں۔ لڑکپن سمجھی میں گزر رہا تھا وہاں ہم چار ہم جولی تھے، لیکن جلد ہی میں نے بقیہ تینوں کو وہیں چھوڑ کر کانپور کی راہ پکڑی تاہم چھٹیوں میں آتے جاتے رہے۔ وہی آم جامن کی بہتات کا موسم ہوتا، تالابوں کی گہرائیاں اور پیڑوں کی اونچائیاں ناپنے کا زمانہ ہوتا۔ گلی ڈنڈا، کبڈی اور مچھلی کے شکار وغیرہ کا موقع بھی، لیکن جلد ہی اس میں بھی رخنہ پڑ گیا۔ سمیع اللہ کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ ساتھ چھوڑ گئے۔ (غلام) ربانی تقسیم کے طوفان میں بہہ گئے۔ صرف محمد بچ رہے۔ بالکل

اتفاق تھا کہ وہ کسی کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے۔اس وقت اس طرف آمدورفت عام بات تھی،لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔محمدکو وہاں کی مرطوب آب وہوا راس نہ آئی۔ان کے گھٹنے سوج گئے۔ چند مہینے بعد ہی واپس آئے لیکن یہاں ان کے بڑے بھائی نے جو پولیس کانسٹبل تھے، بعجلت تمام ساری جائداد اپنے نام لکھوالی۔محمد کو پاکستانی لکھوادیا۔ جب وہ واپس آگئے تو اس کی رپورٹ بھی درج کرادی۔گویا محکمہ جاتی کارگزاری کرکے جائدادکو اپنے حق میں محفوظ کرلیا۔ اس کے بعد جب کوئی پولیس والا اس گاؤں کی طرف آتا اور محمد کے بارے میں تفتیش کرتا تو وہ کسی کے ہاتھ دس روپیہ بھیج کر اپنی راہ پکڑتے۔وقت گزرتا گیا محمد کی شادی بڑے بھائی کی سالی سے ہوگئی اور بچے بھی پلتے بڑھتے گئے۔ایک زمانہ گزرگیا اور پھر یوں ہوا کہ سپاہی جی کا اچانک انتقال ہوگیا۔محمد کے چار بیٹوں میں سے ایک کسی طرح سعودی عرب چلا گیا اور وہاں کسی کام سے لگ گیا پھر چھوٹے بھائیوں کو ایک ایک کرکے بلاتا گیا۔محمد کے گھر میں فراغ دستی کی روشنی پھیل گئی، دوسری طرف ان کے بھتیجے کچھ خاص نہیں کرسکے تو باپ کی جائداد وقتاً فوقتاً بیچتے رہے جسے خود محمد کے بچے ہی خریدتے گئے اور اس طرح ساری جائداد محمد کے حصے میں لیکن قیمتاً آگئی۔شاید زمانہ بڑا انتقامی واقع ہوا ہے۔کوئی دوسال ہوئے محمد کے بیٹے انھیں حج کرانے کے لیے لے گئے۔ان کی صحت کافی خراب چل رہی تھی وہاں سے واپسی کے چند مہینے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

کانپور کا قیام سخت ڈسپلن اور مشقتوں سے عبارت تھا اس لیے دوستی یا دوستداری وغیرہ قسم کی کسی چیز کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔آگے تعلیم کا رشتہ کلکتہ کے فسادات کی وجہ سے منقطع ہوجانے کے بعد تقریباً تین سال کا وقفہ بنارس میں ملازمتیں پکڑنے چھوڑنے میں گزرا۔ وہاں آزادی کی فضا میں دوست داری بھی خوب خوب ہوئی۔ ہمارے ایک عزیز اور عزیز دوست بھی۔جمیل (محمد جمیل الدین ایڈوکیٹ) نے دوستی کا حق ادا کیا وہ انٹرمیڈیٹ کے اسٹوڈنٹ تھے۔انہی کے مشورے پر میں نے انٹرمیڈیٹ کا پرائیویٹ امتحان دینے کا آناً

فاناً فیصلہ کیا اور بالکل آخری تاریخ کو فیس اور فارم وغیرہ جمع کر دیا پھر ایک ہی جگہ قیام کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں خالو جان قاضی محمد اختر صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ جو کلکٹر صاحب کے اسٹینو گرافر تھے اور کچہری کے بالکل سامنے اردلی بازار میں ان کا مکان تھا۔ جمیل ان کے چھوٹے چچازاد بھائی تھے، عمر میں مجھ سے تین چار سال کم رہے ہوں گے۔ پھر یوں ہوا کہ میں روز صبح کو تین بجے اٹھتا اور ایک چھوٹے سے اسپرٹ اسٹوو پر ایک پیالی چائے بنا کر پیتا اور جمیل کی کتابوں اور کلاس نوٹس سے استفادہ کرتا۔ جمیل خواب خرگوش میں ہوتے اور آخرکار امتحان سے کامیاب گزر گیا اور ایک بار پھر کالج کے لیے کانپور کی راہ پکڑی۔

یہ کتاب دراصل وقتاً فوقتاً لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض کسی اخبار یا رسالے میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ چونکہ یکا یک کتاب کی شکل میں انھیں اکٹھا کرنے کا خیال آیا اس لیے ان کے درمیان ظاہری بے ربطی سی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کئی عظیم اور محترم شخصیات کے تذکرے شامل نہیں ہیں جو الگ الگ تصنیفات کے طالب ہیں۔ اسی طرح کئی بظاہر معمولی لیکن اصلاً غیر معمولی افراد کا بھی بطورِ خاص ذکر نہیں ہو سکا ہے۔

مثال کے طور پر منگرو جو میرے بچپن کے زمانے میں مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر سمبھی سے اعظم گڑھ لے جاتے اور لے آتے تھے۔ وہ بنکر برادری سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے پاس کچھ زمین تھی، اسی پر کھیتی گرہستی کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ اس اطراف کے لوگ کام دھندے کے لیے ملایا اور سنگاپور وغیرہ جایا کرتے تھے۔ ایک بار منگرو بھی اس طرف نکل گئے کئی برس بعد ڈھیر سارے سامان اور سرمایے کے ساتھ واپس آئے۔ ان کی عدم موجودگی میں شیخ سعیداللہ صاحب ان کے بال بچوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ منگرو نے اس آمد کے بعد اپنی بیٹی کی شادی کی اور کچھ عرصہ قیام کے بعد پھر مشرق کا رخ کیا اور اس بار اپنے داماد کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا جو اس وقت تک مشرقی ایشیا میں نہیں پہنچی تھی لیکن کچھ دنوں میں پہنچ ہی گئی اور اس علاقے سے آمد و رفت بند ہو گئی۔ منگرو

اوران کے داماد لاپتہ ہوگئے۔منگرو کی بیوی، دو بیٹے اورنو بیاہتا بیٹی شیخ صاحب کے زیرِ سایہ پلتے رہے۔اس کی بیٹی مجھے ذرا ذرا یاد ہے وہ باپ کی طرح تنومند لیکن گوری چٹی تھی، کاجل مسی بھی لگاتی تھی لیکن صبح کو کھلے ہوئے اور شام تک مرجھائے ہوئے پھول سی خاموش رہتی تھی۔اس کا ایک عجب مشغلہ تھا، سفید مٹر کے دانے مختلف رنگوں میں بھگو کر ان کی رنگ برنگی لڑیاں بناتی۔ چڑیا پھنسا کر پنجرے میں بند کر کے اس پر وہ لڑیاں چاروں طرف لٹکاتی۔اس وقت وہ ایک تماشا معلوم ہوتا تھا لیکن اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس نو جوان لڑکی کی مہجوری اور مجبوری کے احساسات کی کیسی خوبصورت اور مکمل ترجمانی تھی۔

جنگ کے بادل چھٹنے کے بعد ایک دن منگرو اوران کے داماد اچانک گاؤں میں وارد ہوئے ڈھیر سارے سامانوں کے ساتھ لیکن ایک مہینہ پہلے وہ لڑکی تپ دق کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر اس نامراد زندگی کے قفس سے آزاد ہو چکی تھی۔

مضامین کی ترتیب میں ایک طرح کی بے ربطی کا مجھے احساس ہے لیکن مقامات اور شخصیات سے متعلق دو طرح کے مضامین کو یکجا کرنے کی کوشش میں ایسا ہونا ہی تھا۔ اگر توقف کرتا تو ان دونوں موضوعات پر الگ الگ کتابیں لکھ سکتا تھا لیکن معلوم نہیں مہلت، فرصت، توانائی اور سب سے بڑھ کر ذہنی یکسوئی بھی نصیب ہو یا نہ ہو اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ جو کچھ ممکن ہے ابھی اور اسی وقت کر ڈالو، سو جو کچھ ہے جیسا کچھ ہے اسے حسبِ توفیق پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کچھ دنوں پہلے ایک نظم ''سمبھی نامہ'' کے عنوان سے لکھی تھی اس کو بھی موقع غنیمت جان کر اس اشاعت میں شامل کر رہا ہوں۔اس میں کمیوں کا مجھے احساس ہے، ممکن ہے کسی ذہنی یکسوئی کے وقت اس میں اضافے کر کے اس کو مکمل کر سکوں۔

کتاب کی نوعیت کی مناسبت سے ٹائٹل تجویز کرنے کی فکر میں تھا اور اپنے نئے پرانے البم الٹ پلٹ رہا تھا اسی میں ایک پرانا فوٹو گراف حسبِ حال معلوم ہوا۔ ہمارے برادرِ عزیز مطیع اللہ کوئریا پار میں اپنے ایک کھیت کے قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ تصویر

میں نے ہی لی تھی جو کہ غالباً ۱۹۶۰ء کے عشرے کی ہے۔اب ہم دونوں کے حلیے بدل کر کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں۔ وہ کلکتہ میں ۱۲-۱۳ برس میرے ساتھ تھے۔اپنی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہماری ملاقات کو دس برس سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے، بس ٹیلی فون سے ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کرلیا کرتے ہیں۔

شیخ سعیداللہ صاحب کی تصویر بھی حسبِ حال معلوم ہوئی۔ یہ فوٹو ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جب وہ کوئریاپار آئے ہوئے تھے میں نے ہی لی تھا۔میرے نواسے طارق اور نواسی رومی نے ان پرانی تصویروں کی اسکیننگ کر کے انھیں قابلِ استعمال بنایا اوراس طرح وہ اس کارِخیر میں شریک ہوگئے۔

رضوان اللہ

متاعِ سحر

رضوان اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیہہ و دہقان پاستانِ مرا
روم و شیراز و اصفہانِ مرا
کشتِ گندم و انبہ بر اشجار
زعفراں زار و بوستانِ مرا

رضوان اللہ

دیباچہ

اجزائے لخت لخت کو شاعری سمجھ کر کچھ دنوں سے اکٹھا کرنے لگا تھا کہ ایک وقفہ ایسا آ ہی گیا کہ جب فرصت اور فراغت کے آثار نمایاں ہوئے، اسی اثنا میں بعض احباب و اقارب خصوصاً برادرِ عزیز پروفیسر فیضان اللہ فاروقی (صدر شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے ایک انتخاب کی اشاعت کا مشورہ دے ڈالا۔ شاید انھیں اس طرح کے کسی موقع کا انتظار تھا لیکن ان کی دانشوری اس مشورے کے عواقب اور مضمرات کا قیاس نہیں کر سکی۔ اپنی طبیعت کو بھی کسی خارجی تحریک کی ضرورت تھی۔ جب یہ دونوں چیزیں بہم ہوئیں تو ایک شک پیدا ہوا کہ ہم جو کچھ شائع کرنے کی سوچ رہے ہیں وہ دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی ہے یا نہیں۔ اب یہ پوتھی لے کر کس کے پاس جائیں، کس کے پاس اتنی مہلت ہے، شاعری وہ بھی بے ڈھب اس پر کون سر مارے، یہ فیصلہ کون کرے کہ کیا درست ہے کیا نادرست۔

ایسے میں ہماری خود رائی کام آئی۔ میں نے سوچا کہ ادب میں کیا درست ہے کیا نادرست اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کچھ اصول ضرور مرتب کیے گئے ہیں، خصوصاً شاعری میں، لیکن جس شاعری کو معتبر سمجھا جاتا ہے کیا اس میں سب کچھ ان معینہ اصولوں کے مطابق ہی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو شاید شاعری میں مضمون اور ہیئت میں نئے تجربے نہ کیے گئے ہوتے، نئی شاعری وجود میں نہ آئی ہوتی۔ شروع شروع میں تو ہر نئی چیز کا استرداد تقریباً یقینی ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ لوگ ہم خیال ہوتے جاتے ہیں، اس طرح ایک اعتبار قائم ہو جاتا ہے۔

بہرحال، حقیقت یہ ہے کہ ادب میں کچھ نظریات مسلم سمجھ لیے گئے ہیں انہی سے قربت یا فاصلے کو درست اور نادرست کا معیار تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ کس تحریر کا معین معیاروں سے فاصلہ کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ باشعور قاری پر چھوڑ دیا جائے۔ وقت دوسرا بڑا حاکم ہے۔ اس سوچ نے ڈھارس بندھائی کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہے اسے سامنے لاؤ۔ اس حقیقت نے بھی حوصلہ بڑھایا کہ آج ادب کو پڑھنے والے کتنے ہیں۔ چند ناقد کسی ادب پارے یا ادیب کے مقام کا فیصلہ کر کے اپنے سحرِ خود آفریدہ میں مبتلا ہوکر آرام فرما ہوجاتے ہیں۔

کوئی نثری یا شعری تخلیق انفرادی طور پر ایک چیز ہے اور کسی کتاب کی صورت میں ان کی تصنیف و تالیف کے بعد پیش کرنا دوسری چیز ہے۔ ایک تخلیقی تحریک اور اسے بروئے کار لانے کے لیے درکار قوتِ عمل تو بہرحال فرق پیدا کردیتے ہیں۔ کتاب کیسی ہی ہو لکھنے والے پر ساری کی ساری بیک وقت نہیں صادر ہوتی بلکہ کم و بیش وقفوں سے جستہ جستہ صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ موضوع کے تسلسل، واقعات کی ترتیب و تشکیل اور قاری پر تاثرات چھوڑنے کی صلاحیت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ شعری تخلیق میں بھی یہی بات ہوتی ہے حالانکہ غزل وغیرہ جیسی شاعری ایک ہی وقت میں اور تقریباً ایک ہی ذہنی اور فکری کیفیت میں مکمل کرلی جاتی ہے تاہم ایک ہی غزل کے مختلف اشعار کے کیف و اثر کے درمیان فرق ہوا کرتا ہے۔

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ جب کسی مسلسل اور مربوط ادبی تصنیف میں اتنے نشیب و فراز ہوسکتے ہیں تو بہت بہت فاصلوں سے مختلف اوقات میں اور مختلف اصناف میں صادر ہونے والی شعری تخلیقات کے معیارات و مراتب میں کتنا فرق ہوگا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اب اگر انھیں کسی کتابی صورت میں اکٹھا کر کے ترتیب دینا ہوتو خود صاحبِ تصنیف کے لیے یہ کام کتنا مشکل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے یہ بوجھ برادرِ عزیز کے آزمودہ کاندھوں پر

ڈال کر اپنا گلا چھڑا لیا۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے اس کے وہ ذمہ دار ہیں۔

میری رائے تو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ شعری تخلیقات کو جب اکٹھا کیا جائے تو انھیں تاریخ کے اعتبار سے مرتب کیا جائے تا کہ اس طرح شاعر کے ذہنی ارتقا کے تدریجی عمل کو سمجھا جا سکے۔ بڑے بڑے اور بسیار گو شعرا کے معاملے میں جن کے کلام کے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہتے ہیں یہ پرکھ آسان ہے لیکن ہما شما کے لیے جو زندگی میں ایک بار ایسی جسارت کر سکتے ہیں دونوں ہی باتیں ناممکن ہیں۔ نہ وقت کے اعتبار سے ان کی ترتیب ممکن ہے نہ مختلف اصناف کی الگ الگ ترتیب و اشاعت جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ شاعر کا طبعی رجحان کس طرف ہے، مثال کے طور پر نظم کی طرف یا غزل کی طرف یا اس کی شاعری محض وقتی محرکات کی تابع ہے۔ ان باتوں سے قطعِ نظر ایک بات مسلم ہے وہ یہ کہ نظم ہو یا غزل اس کی تخلیق میں ایک حرارت جزوِ اعظم ہے وہ جتنی زیادہ ہوگی کلام میں اثر اتنا ہی زیادہ ہوگا اور اس کا ادبی مقام بھی ارفع۔ صرف شعری تخلیقات کے بارے میں ایسا نہیں ہے بلکہ نثری تخلیقات کے معاملے میں بھی یہی بات درست ہے۔ اس داخلی حرارت کے بغیر غزل نہ اچھی غزل ہو سکتی ہے، نہ افسانہ اچھا افسانہ۔

جہاں تک اس مجموعہ کے مشمولات اور ان کی ترتیب کا تعلق ہے اردو شاعری کی بعض روایات شعور یا تحت الشعور میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہیں اور بوقت ضرورت ان کی کارفرمائی کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کا جہاں تک تعلق ہے شاید مذکورہ بالا روایات کی کارفرمائی ہے کہ پہلے پابند یا روایتی نظمیں ہیں ان کے بعد معرا یا آزاد نظمیں ہیں۔ اس کے بعد غزلیں ہیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ کچھ فارسی کلام کو بھی اسی مجموعہ میں شامل کر دیا جائے کیونکہ وہ بحیثیت مجموعی اتنے نہیں کہ ان کے لیے کسی علیحدہ اشاعت کی جسارت کی جائے چنانچہ غزلوں کے بعد آخر میں انھیں رکھا گیا ہے۔ اس میں

چند نظمیں اور چند غزلیں ہیں۔ یہ اس یاد دہانی کے طور پر ہیں کہ فارسی ادب بھی ہمارے مجموعی ادبی اثاثے کا معتبر اور قابلِ احترام حصہ ہے۔ ان معروضات کے ساتھ اپنی شعری کاوشوں کا انتخاب پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

رضوان اللہ

شگوفے ۱

بے ادبیات

رضوان اللہ

سببِ تصنیف وتشکر

اس کتاب میں شامل مضامین اور منظومات کو لکھتے وقت یہ گمان نہ تھا کہ ان کو کبھی کتابی صورت میں یکجا کیا جائے گا۔ چنانچہ اب ان کی جو صورت اور ہیئت ہے، اس کے لیے میں ذمہ دار نہیں۔ اس کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں جن کی وجہ سے یہ نوبت آئی ہے۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں جس سے میری نیک نامی میں اضافہ ہو یا میری گمنامی میں کمی آئے۔

لیکن اس تصنیف کا ایک سبب بھی ہوا۔ ایک منظّم گروہ نے اس پروپیگنڈے کی مہم چلادی کہ اردو زبان اب گئی تب گئی۔ دوسری طرف میں اپنے اس راسخ اعتقاد کے باوجود کہ یہ زبان اتنی آسانی سے مٹنے والی نہیں، اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وہم میں مبتلا ہوگیا کہ شاید زبان وادب کے موجودہ معیار برقرار نہ رہ سکیں۔ اس اندیشے کے جاں گزیں ہوتے ہی میں نے اپنے توشہ خانے کے پٹ کھولے اور اس کو کھنگال کر کچھ مال برآمد کیا کہ اس کے بے وقت ہونے سے پہلے اسے جوں توں منظرِ عام پر لاکر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرلوں۔ چنانچہ دستیاب مواد کو دو زمروں یعنی نثر ونظم میں تقسیم کیا اور انہیں دو عنوانات ''بے ادبیاں'' اور بدنظمیاں'' کے تحت ترتیب دیا اور اس مجموعہ کو ''بے ادبیات'' کا نام دیا۔

اس تصنیف کی تحریک سے لے کر طباعت تک جن حضرات نے دست گیری کی اور

حوصلہ بڑھائے رکھا، ان کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ پروفیسر شمیم حنفی، جناب اظہر غوری اور جناب فرحت احساس کا بالخصوص سپاس گزار ہوں۔ جن حضرات نے دھکا دے کر مجھے اس کگر تک پہنچایا جہاں جست لگانے کے سوا چارہ نہ تھا، وہ ہیں جناب عبدالحئی اور جناب محمد اعظم۔ ان کا صرف شکریہ ادا کرنا کافی نہیں۔ اگر وہ اپنے اس عمل میں مخلص تھے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں، تو منجانب اللہ ماجور ہوں گے۔ دلی اردو اکاڈمی اور دیگر اکاڈمیاں بھی ہم جیسے ''ناداروں'' کے شکریہ کی خاص مستحق ہیں کہ ہمیں باہر آنے کے لیے بیساکھیاں فراہم کرتی ہیں۔ خدا ان کی تعداد اور توفیق زیادہ کرے۔

رضوان اللہ

باعثِ تاخیر

اپنی پانچ تصنیفات ویب سائٹ پر دے چکا تو سوچنے لگا کہ ''بے ادبیات کو اس سعادت سے کیوں محروم رکھا جائے جبکہ تصنیفی سفر میں پہلی تجرباتی کاوش یہی تھی۔اس تصنیف کی کچھ وجوہ تھیں تو اس کو اپ لوڈ کرنے میں تاخیر کی بھی کچھ وجہ ہوئی۔۱۹۹۲ء میں جب میں ریٹائر ہوا تو لکھنے لکھانے کا مرض چالیس برس پرانا ہو چکا تھا، ظاہر ہے اتنا پرانا مرض جیتے جی تو چھوٹ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ چند ماہ ذہنی خلا یا گمشدگی کے عالم میں رہنے کے بعد حواس بجا ہوئے تو سوچا لاؤ قلم کی روانی کی آزمائش کریں۔طنز و مزاح کی ڈگر اس خیال سے پکڑی کہ اس میں فکری اور زبانی ہر طرح کی بے راہروی کھپ جائے گی۔اعتماد کچھ اور بحال ہوا تو کوئی کالم لکھنے کا خیال آیا، اس کے لیے ''پس چہ باید کرد'' کا عنوان تجویز کیا اور اس کے تحت ہفتہ وار مضامین روزنامہ آزاد ہند اور روزنامہ اخبارِ مشرق کلکتہ میں بھیجنے لگا جہاں پر میرے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ بذلہ سنجی کے لیے قومی آواز کا انتخاب کیا۔ میری خوش قسمتی سے اس کا دہلی ایڈیشن شائع ہونے لگا تھا اور کچھ مروتیں بھی کام آئیں چنانچہ نظم و نثر میں جو کچھ قلم سے سرزد ہوتا رہا قومی آواز کے حوالے کرتا رہا۔

کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جو شائع شدہ مواد اکٹھا ہوا اس کے دباؤ کی وجہ سے جو چلبلی پیدا ہوئی اس نے کسی تصنیف کے خیال کو راہ دی اور اس خیال نے ساری خرافات کی چھان پھٹک کے بعد ایک انتخاب اور پھر نثر و نظم کے دو حصوں میں اس کی تقسیم کی صورت گری

کی ۔شکر ہے ایسے میں پاسبانِ عقل نے دل کوتنہا نہیں چھوڑا اوراس کو اپنا دامن تھمائے رکھا، چنانچہ نثر ونظم میں دو الگ الگ تصنیفات کے ضیق سے بچ گیا۔ایک تصنیف کا فائدہ یہ ہوا کہ دہلی اردو اکاڈیمی کی چھتری بھی آسانی سے مل گئی۔ یہ تو رہا اس تصنیف کا سبب۔اس کو اپ لوٹ کرنے میں تاخیر کا سبب بھی تھا۔

میرا خیال ہے کہ طنز ومزاح لکھنا ادب کی دیگر اصناف سے زیادہ مشکل ہے۔ وقتاً فوقتاً یہ مضامین لکھتے وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن کچھ مضامین چھپنے کے بعد اس کا احساس ہونے لگا۔ ''بےادبیات'' کی اشاعت کے بعد جب ایک قاری کے طور پر اس کو پڑھا اور بار بار پڑھا تو وہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ گئی۔اس کی اشاعت کے چودہ پندرہ برس گزر جانے کے بعد بہت کچھ بدل گیا ہے، دنیا بدل گئی ہے،لوگوں کی سوچ اور مزاج بدل گئے ہیں،سب سے بڑھ کر لوگوں کے ذوق بدل گئے ہیں۔ادب میں انحطاط کے ساتھ ساتھ مزاح کی زبان میں ابتذال بڑھتا جارہا ہے۔اس سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت کہ لوگوں کی قوت برداشت کمزور ہوتی جارہی ہے اوراس کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی بڑھتی جارہی ہے۔ اس قدر بدلے ہوئے حالات میں لازم تھا کہ تحریروں پر پوری احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی جائے تاکہ متروک محاورے وغیرہ کہیں راہ نہ پائیں۔ دراصل یہ کام کسی اور کو کرنا چاہیے تھا لیکن مجبوراً خود ہی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس احتیاطی کوشش کے نتیجے میں بعض مضامین یا نظموں کو اس آن لائن ایڈیشن میں شامل نہ کرنا مناسب معلوم ہوا۔ یہ بازخوانی اور سوچ بچار اس کتاب کو اپ لوڈ کرنے میں تاخیر کا موجب ہوا۔ اب جو کچھ اور جیسا کچھ ہے ناظرین کے پیشِ خدمت ہے۔

رضوان اللہ

۵رستمبر ۲۰۱۵ء

MY REFLECTIONS

عکسِ خیال

Rizwan Ullah

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ما چراغ ہستیم و پروانہ خودیم
طرفہ خود آگاہ و دیوانہ خودیم
پاسدارِ آبروئے دردِ خویش
ما صدف ہستیم و دُردانہ خودیم

I am the lamp, and the moth myself,
A peculiar self-conscious and crazy myself,
A defender of the honour of my own pain,
I am the shell and the pearl myself.

PREFACE

In a state of excitement, and the head swollen with euphoria, it occurred to me to translate some of my Urdu poems into English. What to do with it? Will think about it later. Sometimes it simply happens, you think of doing something and it is granted. Perhaps such are moments when Graciousness is extremely benevolent and bestows whatever is beseeched. It happened in this case. My ideas began to take shape slowly but steadily just as you get images on your computer screen from nowhere. Line after line, poem after poem appeared in a new language form.

The next thing that occurred to me was to let this new language form of my poems ascend to the same height from where ideas trickle down to a receptive mind. A blog came into existence ready to receive and preserve what was communicated to it, and was ready to be shared with whoever had the inclination to observe it. Here comes the most important and basic role of Abdul Wasey, Deputy Editor of the Finance World, who had returned to India a couple of years ago after over a decade long strides in the Gulf media. He created the blog "rizwanullah.blogspot.com" on February 14, 2011, and posted some of my works on it.

I put verses in Urdu script on the blog alongside the English version so as to enable a visitor, if he wishes, to make his comments and suggest improvements in translations. All the verses in this book except a couple of them are included in two collections published earlier: *Auraq-e-Musawwar* (2002) and *Mata-i-Sahar* (2008). Thus the present book is a collection of selected poems with their English translations.

Surprisingly enough, Mr. Shamsur Rahman Farooqi was the first person to write his comments on the contents of the blog which were not much by that time. He wrote:

"I like the idea of Urdu poems appearing with their English translations which have been made by the author himself. The Urdu poems are quite good, if somewhat simple but the English translations are generally excellent, certainly better than anything I have seen recently."

Then he goes on to add:

"I suggest that Mr. Rizwan Ullah append his surname 'Farooqi' because then we'll all be connected with him immediately as one of our own widespread clan."

Shamsur Rahman Farooqi

Posted at 11.30 AM on July 29, 2011

A few words, just a few words, about Farooqi:

A ground breaker and a trail blazer at a time when Urdu language was gasping for life in free India and the tide of progressive

writing was ebbing. In abounding gloom of an uncertain future of the Urdu language he launched "***Shabkhoon***", a literary magazine which he has been running for about half a century; an untiring writer of inexhaustible energy who left no genre of Urdu prose and poetry without his indelible mark be it criticism, short story or novel and lexico- graphy in addition to scores of books, lectures in various Indian and foreign universities as a visiting professor and countless articles in Urdu and English are published in papers world over and a recipient of highest awards.

(He passed away on December 25, 2020)

Some friends in Calcutta saw a bunch of the blog items and encouraged me to continue my efforts. In fact, I had sent that bunch to my old friend Mr. Qaisar Shamim, Ex. Vice-Chairman of the West Bengal Urdu Academy, who shared it with other friends and exhorted me verbally to continue. Mr. Zahir Anwar, a well-known writer and a literary critic sent his comments in English and Urdu both. Mr. F.S. Ejaz, Editor of monthly "***Insha***" wrote his comments in Urdu. I am giving their short excerpts here but will put them fully on my blog.

"The creative energy in the original Urdu verses and the genuine effort of the poet himself to convey the meaning and essence of the original in English language are commendable and touched me."

Zahir Anwar, Calcutta

رضوان اللہ صاحب کا شعور انھیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ

نہیں ہونے دیتا۔ ان کی ایک سے زائد فنّی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی مترجم کی حیثیت کا۔ گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی۔

ف.س. اعجاز
کلکتہ

As for contents, various forms of poems make a substantial part of it. In the words of Farooqi, my poems are plain and simple. In fact, it is in the very nature of poems for generally they are narrative and descriptive. It also means that they are easily and conveniently translatable. The case of ghazals is different. Complications of human feelings and means and methods of their expression, and also references to past events and incidents therein and all sorts of nuances of the language create complications and make translations difficult, and sometimes incomprehensible. However, most of the poems and ghazals included in this selected translation being plain and simple are easily comprehensible. In the selection of ghazals their simplicity and translatability have been particularly taken into consideration. It was easy to do so as the ghazals are my own doings. I expressed a certain idea in one form which could be easily communicated in a different language. But still every language has certain nuances that are subtle, difficult and sometimes impossible to translate and explain in another language. It happens and it has happened here as well.

I wish I could include some humour but I was afraid of the difficulties in its translation and I was sure that it would not be

possible to create the same refreshing effect in the translation so, I thought, the exercise would not be worth doing.

When it came to arranging contents of this book I grouped them in three categories: One, free verses, second, ghazals and lastly, traditional poems that are comparatively longer than free verses.

I discussed it with Abdul Wasey, who is my wife's nephew and intellectually very close to me, and that closeness persisted in spite of his engagements in the Gulf media for over a decade. However, after some discussion we agreed over the arrangement of the contents as mentioned above. My idea about that grouping and arrangement of poems was that smaller poems, as the free verses are, give a compact picture of the subject-matter in a short reading time and thus the reader does not need to wait with a long reading to reach the depth of the matter. A reader today caught in the midst of many pulls and pushes has little time to spare and shorter patience. Thus he can glance at poem after poem if his interest and patience continue like the verses of a ghazal. The nature of these poems gives the reader an insight into the mind and ideas of the poet and his views about various matters and issues.

A thorough assessment or appreciation of one's own work is not easy for a writer but this book is a collection of already selected poems and the writer would have obviously made the selection from a lot of accumulated material according to his liking and preferences, so this presentation must divulge the trend of his mind.

From the very beginning it exposes an air of pathos and sadness and that thought process seems to continue throughout till the end. It begins with the poem "The Solitary Book". Obviously it is the story of life and ends with the poem "The Last Chapter of the Book." It hints at the conclusion of the same book. But there are lighter and brighter spots also. There are descriptions of important events in national and personal life which unavoidably contain sad and pathetic references such as "The Division" or the "Calcutta Riots" or "The Bengal Famine". However, the life seems to revolve round and evolve in the air and atmosphere of Calcutta, which is very natural as the author got there everything stored for him in life. But still readers may have their own perception and appreciation. I do not have any intention to colour or influence readers' views.

However, I may reiterate my belief that a book is a living creature with its material and sublime, that is, spiritual forms; the former is visible but the latter is perceptible through its effects as you would do with air, for instance. Books do reproduce as well. Books contain and disseminate thoughts and ideas of the writer, their creator and cause a response from those who come into contact. Thus the material existence of the book when handled causes the spiritual effect. So like all creations, a book must contain a certain amount of writer's person, which must be his reflections. So the contents of this book are the reflections of the poet originally expressed in Urdu then translated in English and put on the blog; to conclude then the

simplicity and pathos obvious in the contents of the book are in fact exposition of the writer's thoughts.

Lastly, I want to express my gratitude to all who encouraged me directly or indirectly to continue my efforts in my chosen direction. I have a deep feeling of gratitude for my dear Abdul Wasey but for whose assistance and cooperation it would not have been possible for me to continue on this arduous track to reach the almost unreachable goal. The encouragements I have received make me feel humble. I thank them all.

Rizwan Ullah

SHAGOOFEY

Rizwan Ullah

D-178, Abul Fazal Enclave-I, Jamia Nagar,
New Delhi - 110025, Mob.: 9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com, Web: www.Rizwanullah.com